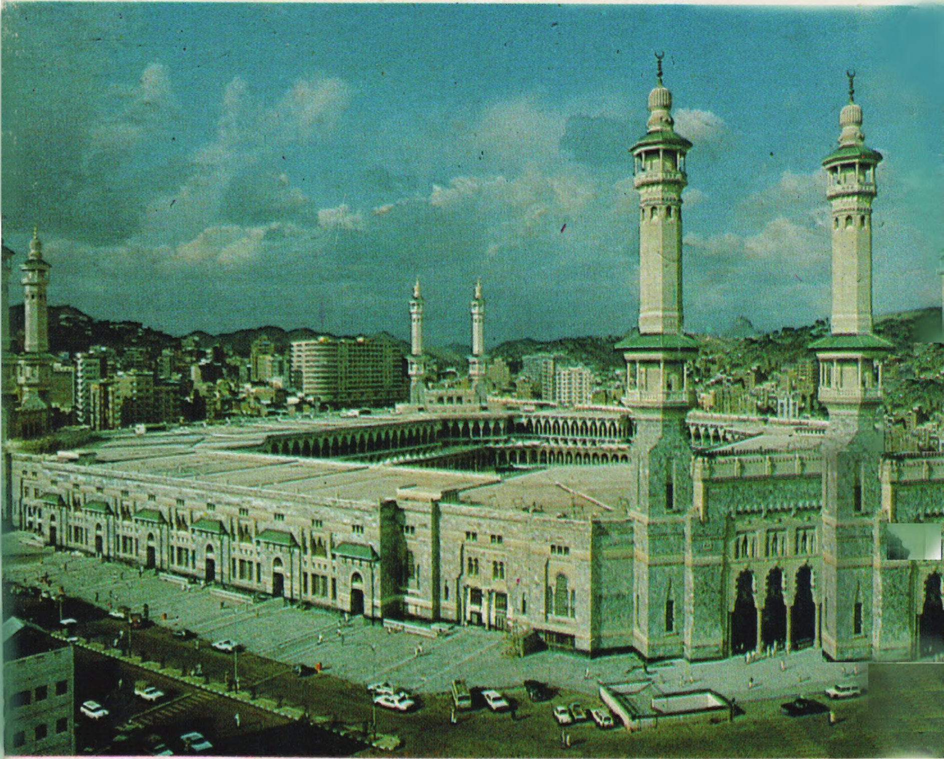
الرسالہ

Al-Risala

September 1994 Issue 214 Rs. 6

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز



پیچھے دیکھنے والا پیچھے کی طرف سفر کرتا ہے
اور آگے دیکھنے والا ہمیشہ آگے کی طرف۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسول	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

مطالعۂ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	-
کتاب زندگی	40/-
انوارِ حکمت	-
اقوالِ حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	20/-
عقلیاتِ اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	30/-
تعددِ ازدواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسول	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
الاسلام یتحدی	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتینی واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	7/-

God Arises	85/-
Muhammad The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	40/-
God-Oriented Life	60/-
Religion and Science	40/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad	5/-
The Ideal Character	
Tabligh Movement	20/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of the Prophet	--
Islam the Voice of Human Nature	--
Islam the Creator of Modern Age	--

آڈیو کیسٹ

حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسول	25/-
میدانِ عمل	25/-
پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

حقیقتِ روزہ	150/-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

ستمبر ۱۹۹۴، شمارہ ۲۱۴

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax : 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

خدا کا عقیدہ

کہا جاتا ہے کہ خدا کی بنیاد پر کائنات کی توجیہہ کرنا اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ کیوں کہ پھر فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا نے کائنات کو بنایا تو خدا کو کس نے بنایا۔

مگر یہ ایک غیر منطقی سوال ہے۔ اصل مسئلہ "بے سبب" خدا کو ماننا نہیں ہے۔ بلکہ دو "بے سبب" میں سے ایک بے سبب کو ترجیح دینا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک پوری کائنات موجود ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں۔ ہم اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہم کائنات کے وجود کو ماننے پر مجبور ہیں۔ ایک شخص خدا کو نہ مانے، تب بھی عین اسی وقت وہ کائنات کو مان رہا ہوتا ہے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کائنات کو بے سبب مانے۔ مگر اس قسم کا عقیدہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ کائنات میں تمام واقعات بظاہر اسباب وعلل کی صورت میں پیش آتے ہیں۔ ہر واقعہ کے پیچھے ایک سبب کارفرما ہے۔ اس طرح خود کائنات کی اپنی نوعیت ہی یہ چاہتی ہے کہ اس کے وجود کا ایک آخری سبب ہو۔ جب کائنات کے حال کا ایک سبب ہے تو اس کے ماضی کا بھی لازمی طور پر ایک سبب ہونا چاہیے۔ یعنی وہی چیز جس کو علت العلل کہا گیا ہے۔

بے سبب کائنات کو ماننا ممکن نہیں، اس لیے لازم ہے کہ ہم اس کا ایک سبب مانیں۔ کائنات لازمی طور پر اپنا ایک آخری سبب چاہتی ہے۔ یہی منطق اس کو لازم قرار دیتی ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔ اس لاینحل مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری کوئی بھی تدبیر ممکن نہیں۔ جب ہم بے سبب خدا کو مانتے ہیں تو ہم دو ممکن ترجیحات میں سے آسان تر کو ترجیح دیتے ہیں۔ بے سبب خدا کو مان کر ہم اپنے آپ کو بے سبب کائنات کو ماننے کے ناممکن عقیدہ سے بچا لیتے ہیں۔

خدا کو ماننا عجیب ہے۔ مگر خدا کو نہ ماننا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ خدا کو مان کر ہم صرف زیادہ عجیب کے مقابلہ میں کم عجیب کو اختیار کرتے ہیں۔

یہ صرف خدا کے وجود کا معاملہ نہیں۔ خالص سائنسی نقطۂ نظر سے، اس دنیا میں کوئی بھی چیز نہ ثابت (prove) کی جا سکتی اور نہ غیر ثابت (disprove) کی جا سکتی۔ کسی بھی چیز کو ماننے کے

معاملہ میں یہاں انتخاب (option) ثابت شدہ (proved) اور غیر ثابت شدہ (unproved) کے درمیان نہیں۔ بلکہ ہر انتخاب ورک ایبل (workable) اور نان ورک ایبل (non-workable) کے درمیان ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اہل سائنس عام طور پر کشش (gravity) کے نظریہ کو مانتے ہیں مگر یہ ماننا اس لیے نہیں کہ کشش ثقل کوئی ثابت شدہ نظریہ ہے۔ نیوٹن نے سیب کو درخت سے گرتے ہوئے دیکھ کر یہ سوال کیا تھا کہ سیب نیچے کیوں آیا اور پھر تحقیق کر کے اس نے کشش ارض کا نظریہ دریافت کیا۔ مگر ایک سائنس داں نے کہا کہ نیوٹن کو اس پر تعجب ہوا تھا کہ سیب نیچے کیوں آیا۔ مجھے یہ تعجب ہے کہ سیب اوپر کیسے گیا۔

درخت کی جڑ نیچے کی طرف جاتی ہے اور اس کا تنہ اوپر کی طرف۔ اگر جڑ کے نیچے جانے کا سبب یہ بتایا جائے کہ زمین میں کشش ہے تو تنہ اور شاخوں کے اوپر جانے کی توجیہہ کس طرح کی جائے گی۔

یہی معاملہ تمام سائنسی نظریات کا ہے۔ سائنس میں جب بھی کسی نظریہ کو مانا جاتا ہے تو وہ غیر ثابت شدہ کے مقابلہ میں ثابت شدہ کو ماننا نہیں ہوتا۔ بلکہ نان ورک ایبل تھیری کے مقابلہ میں ورک ایبل تھیری کو ماننا ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی اصول نظریۂ خدا کے معاملہ میں بھی چسپاں ہوتا ہے۔

کشش کے معاملہ میں ہمارے لیے جو انتخاب ہے وہ باکشش مادہ اور بے کشش مادہ میں نہیں ہے۔ بلکہ باکشش مادہ اور غیر موجود مادہ میں ہے۔ چونکہ غیر موجود مادہ کا نظریہ ورک ایبل نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے باکشش مادہ کا انتخاب لے رکھا ہے، خالص علمی اعتبار سے یہی معاملہ خدا کے عقیدہ کا بھی ہے۔

کائنات کے اندر تخلیق کی صلاحیت نہیں، وہ اپنے اندر کے ایک ذرہ کو نہ گھٹا سکتی اور نہ بڑھا سکتی۔ اس لیے، دوسرے تمام سائنسی نظریات کی طرح، یہاں بھی ہمارے لیے انتخاب باخدا کائنات (universe with God) اور بے خدا کائنات (universe without God) میں نہیں ہے۔ بلکہ باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات (non-existent universe) میں ہے۔ چوں کہ ہم غیر موجود کائنات کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ باخدا کائنات کے نظریہ کا انتخاب کریں۔

علماء کا مسلک

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں (النساء ۱)
ابن کثیر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پیدائش کی اصل ایک باپ اور ایک ماں سے ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے کی طرف مائل ہوں (ان اصل الخلق من اب واحد وام واحدۃ لیعطف بعضھم علی بعض (تفسیر ابن کثیر ۱/۴۴۸)

النسائی، احمد اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ تمام انسان یکساں طور پر اللہ کے بندے ہیں اور سب آپس میں بھائی بھائی ہیں (ان العباد کلھم اخوۃ) اسی طرح خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے تھے (الا کلکم بنو آدم و آدم من تراب)

اس اسلامی اصول کے مطابق، مسلمان اور غیر مسلم سب ایک دوسرے کے لیے بھائی بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کی صحیح ترین صورت یہ ہے کہ اس کو برادرانہ بنیاد پر استوار کیا جائے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس کو "متحدہ قومیت" سے تعبیر کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مولانا موصوف کی کتاب، متحدہ قومیت اور اسلام، مطبوعہ ۱۹۳۸، مجلس قاسم العلوم دیوبند) مولانا حسین احمد مدنی کے ہندو مسلم اتحاد کے نقطۂ نظر کو مزید سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو: مکتوبات شیخ الاسلام، جلد اول، مکتوب ۶۳، صفحہ ۱۴۱ - ۱۴۷

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان کے تقریباً تمام علماء اس مسلک پر متفق تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی بھائی کی طرح متحد کرنا چاہتے تھے۔ مگر بعض ناموافق اسباب کی بنا پر، قومی اتحاد کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس، دونوں فرقوں کا تعلق، تقسیم اور علاحدگی پسندی کی بنیاد پر قائم ہو گیا۔ اس تفریقی سیاست کے نہایت مہلک نتائج برآمد ہوئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ سیاست کا طوفان ختم ہوا تو مولانا ابو الکلام آزاد نے دسمبر ۱۹۴۷ میں لکھنؤ میں ایک مسلم کانفرنس کی۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر صدارتی تقریر کرتے

ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ملک کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی ضروری چیز نہیں ہو سکتی کہ فرقہ واریت کو جو مذہب کے نام پر ابھاری گئی ہے، ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔ اگر ہمیں بربادی سے بچنا ہے تو فرقہ پرستی کے تمام دروازوں کو ہمیں بند کرنا پڑے گا۔ اور ہندو مسلم تعلق کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بنیاد پر قائم کرنا ہوگا۔

ضرورت ہے کہ علماء کے اس مسلک کو جو مکمل طور پر قرآن و سنت پر مبنی تھا، اس کو دوبارہ پوری طاقت کے ساتھ زندہ کیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے لیے بلاشبہ صحیح اور مفید پالیسی یہی ہے کہ اس ملک میں دونوں فرقوں کے تعلق کو اخوت اور اتحاد کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔

الرسالہ مشن پچھلے ۲۰ سال سے یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس مشن کو اسلام اور علماء اسلام کی مکمل تائید حاصل ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس اصلاحی مہم کو مزید موثر اور کامیاب بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں چند بنیادی نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ احساس کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے۔ ان کے باہمی تعلق کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ اس کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے کہ دونوں فرقوں کے درمیان معتدل فضا میں برادرانہ اختلاط ہونے لگے۔

۲۔ مسلمان احتجاج غیر کے بجائے تعمیر ذات کو اپنی مستقل پالیسی بنائیں۔ وہ احتجاج اور مظاہرہ اور جلوس کے طریقہ کو یکسر چھوڑ دیں۔ شکایت کے مواقع پر وہ ٹکراؤ سے بچیں اور ہمیشہ پُر امن تدبیر کے ذریعہ نزاعی معاملات کو طے کرنے کی کوشش کریں۔ نزاع کے موقع پر ٹکراؤ کا طریقہ نزاع کو بڑھاتا ہے اور مفاہمت کا طریقہ نزاع کو ختم کر دیتا ہے۔

۳۔ تعلیم اور اقتصادیات کو سب سے زیادہ قابل توجہ چیز قرار دیا جائے۔ مسلمانوں میں تعلیم اگر عام ہو اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو جائے تو اس کے بعد تمام مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

۴۔ ہر مقام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ امن کمیٹیاں بنائی جائیں۔ اس کے ذریعہ یہ کوشش ہو کہ امن اور اتحاد کو برہم کرنے والے ہر واقعہ کو ابتدا ہی میں حسن تدبیر سے ختم کر دیا جائے۔

۵۔ لوگوں میں یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا سیکھیں۔ رایوں کے فرق کے باوجود ایک دوسرے کی عزت کریں۔

امید کا نظام

وما اصابکم من مصیبۃٍ فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر۔ (الشوریٰ ۳۰)

اور جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں ہی سے۔ اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی جب بھی دنیا میں کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اس کے اپنے ہی کسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کسی دوسرے کی زیادتی کی شکایت کرنا بے معنی ہے۔ جب ہر آدمی خود اپنے کیے کو بھگت رہا ہو تو دوسرے کے خلاف شکایت اور احتجاج کرنا صرف وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ قدرت کا بنایا ہوا نظام ہے اور اس نظام میں ہمارے لیے خوش خبری ہے۔ وہ ہمارے لیے عظیم الشان امید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قدرتی نظام نے ہمارے مسائل کے حل کو خود ہمارے اپنے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم کو اس کا محتاج نہیں کیا کہ ہم کسی دوسرے کی مہربانی کا انتظار کریں۔

کوئی آدمی جن مسائل سے دوچار ہو اگر اس کا سبب کچھ دوسرے لوگ ہوتے تو گویا کہ ہم دوسروں کے اوپر منحصر ہوتے۔ ہمیں دوسروں کی عنایت کا انتظار کرنا پڑتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کا نظام اس طرح بنایا کہ یہاں ہر آدمی کا معاملہ اس کے اپنے ہاتھ میں رکھ دیا۔ یعنی ہر آدمی اپنی ہی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ ہر آدمی کا مستقبل خود اس کے اپنے اختیار میں ہو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نادانی کی بنا پر نقصان اٹھاتا ہے، ایسے لوگ دوبارہ دانش مندی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے آپ کو نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ کبھی کسی کا معاملہ غیر منصوبہ بند انداز میں کام کرنے کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے، اس کے لیے موقع ہے کہ آئندہ وہ منصوبہ بند انداز میں کام کر کے از سر نو اپنے معاملہ کو درست کر لے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش کو اپنا کر آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے، اب اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ صبر کی روش کو اپنا کر دوبارہ اپنے آپ کو مصیبتوں سے بچا لے۔ کبھی کچھ لوگ جذباتی اقدام کر کے اپنے کو بربادی میں ڈال دیتے ہیں، ان کے لیے موقع ہے کہ وہ حقیقت پسندی کے اصول پر چل کر دوبارہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائیں۔

ترقی کے آداب

اس دنیا میں ہر آدمی ترقی کرنا چاہتا ہے۔ مگر بہت کم آدمی ہیں جو فی الواقع کوئی بڑی ترقی حاصل کرتے ہوں۔ زیادہ لوگ معمولی یا اوسط درجہ کی زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔

اس کا سبب کیا ہے۔ کیا کچھ لوگ خوش قسمت پیدا کئے گئے ہیں اور کچھ لوگ پیدائشی طور پر محروم اور بدقسمت ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ایسا کہنا خدا پر بے انصافی کا الزام عائد کرنا ہے۔ اور خدا کبھی کسی کے ساتھ بے انصافی کا معاملہ نہیں کرتا۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی بڑی بڑی ترقیوں کا امکان اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ جو آدمی عقلمندی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتا ہے وہ اعلیٰ ترقی حاصل کرتا ہے۔ اور جو آدمی اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتا۔ یا اسی کے ساتھ مہلک نادانیاں بھی کرتا رہتا ہے وہ کامیابی اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔

مثلاً کچھ لوگ چھلانگ لگانے کی فکر میں پڑے رہتے ہیں۔ حتی کہ بعض اوقات غیر دانش مندانہ طور پر چھلانگ لگا کر اپنا ہاتھ پاؤں توڑ لیتے ہیں۔ حالاں کہ اس دنیا میں ترقی ہمیشہ لمبی محنت اور مستقل کوشش سے ملتی ہے۔ وقتی چھلانگ لگانے سے کسی کو ترقی نہیں مل سکتی۔

کچھ لوگ دوسروں سے چھین جھپٹ میں ترقی کا راز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بہت بڑی بھول ہے۔ دوسرے کی چیز کبھی آپ کی چیز نہیں بن سکتی۔ اگر بالفرض آپ کسی غلط تدبیر سے دوسرے کی چیز کو ہڑپ کر لیں۔ دوسرے کی چیز پر ناجائز قبضہ کر کے بیٹھ جائیں تو اس طرح آپ کبھی ترقی کا مقام نہیں پا سکتے۔ یہ قدرت کے قانون کے خلاف ہے۔ قدرت کا قانون جلد یا بدیر آپ کو رسوا کر کے رکھ دے گا۔ وہ آپ کی آئندہ نسلوں تک کو ترقی اور کامیابی سے محروم کر کے چھوڑ دے گا۔

کچھ لوگوں کی ترقی اس لئے رک جاتی ہے کہ وہ حرص اور خود غرضی میں حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹ لیں، دوسروں کو کچھ نہ ملنے دیں۔ حالاں کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اُس کو اِس طرح بنایا ہے کہ یہاں دینے والا پائے۔ دوسروں کو نفع پہنچانے والا خود بھی نفع اٹھائے۔ اپنی کمائی میں دوسروں کا حصہ لگانے والا دوسروں کی کمائی میں

حصہ دار بنے۔

کچھ لوگ حسد اور جلن میں پڑ کر اپنی ترقی کا راستہ روک لیتے ہیں۔ جب وہ کسی کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کی کاٹ میں لگ جاتے ہیں۔ وہ اس کی کامیابیوں پر جلنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھیں تو آپ بھی آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ دوسروں کی ترقی سے آپ کے اندر شوق پیدا ہونا چاہئے نہ کہ حسد۔

بڑی ترقی حاصل کرنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ آپ دوسروں کو ساتھ لے کر چل سکیں۔ کوئی بھی آدمی اکیلے اکیلے بڑی ترقی حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ اگر بڑی ترقی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو دوسروں کا دل جیتنا ہوگا۔ دوسروں کے اندر اپنا اعتماد پیدا کرنا ہوگا۔ اس طرح رہنا ہوگا کہ دوسرے لوگ آپ کو اپنا سچا خیر خواہ سمجھیں۔ آپ کو ایسا بننا ہوگا کہ جو کچھ آپ اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہی آپ دوسروں کے لئے بھی پسند کریں۔ اور جو کچھ آپ کو اپنے لئے پسند نہیں ہے وہ آپ کو دوسروں کے لئے بھی پسند نہ ہو۔

اس دنیا میں ترقی ہر آدمی کا حق ہے۔ ترقی ہر آدمی کا مقدر ہے۔ ترقی ہر آدمی کے لئے لکھ دی گئی ہے۔ مگر ترقی صرف اس کے لئے ہے جو ترقی کے اصول اور آداب کو جانے اور ان کو درست طور پر اپنی زندگی میں استعمال کرے۔

زلزلہ قدرت کا ایک مظہر ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں زلزلے آتے رہتے ہیں۔ پہلے جب زلزلہ آتا تھا تو بہت زیادہ جانی نقصان ہوتا تھا۔ مگر اب ترقی یافتہ ملکوں، مثلاً جاپان، کیلی فورنیا (امریکہ) وغیرہ میں زلزلہ آتا ہے تو بہت کم آدمی مرتے ہیں۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مطالعہ اور تجربہ سے لوگوں نے جانا کہ زلزلہ میں جان کا نقصان زیادہ تر مکانوں کے گرنے سے ہوتا ہے۔ اس کا حل زیادہ پختہ یا زیادہ مضبوط مکان بنانا نہیں ہے۔ کیوں کہ زلزلہ کے مقابلہ میں کوئی بھی مکان مضبوط نہیں۔ اسی طرح اس کا یہ حل بھی نہیں تھا کہ زلزلہ کے خلاف شکایت اور احتجاج کیا جائے۔ کیوں کہ زلزلہ نیچر کے قانون کے تحت آتا ہے، اور نیچر کے خلاف احتجاجی شور و غل کبھی موثر نہیں ہو سکتا۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اس مسئلہ کا حل یہ نکالا گیا کہ وہ لوگ اپنے مکان زیادہ پختہ

بنانے کے بجائے لوز انداز میں بنانے لگے۔ وہاں زلزلہ اب بھی آتا ہے۔ مگر اب یہ ہوتا ہے کہ زلزلہ کے جھٹکے کے وقت مکانات صرف ہل کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ٹوٹ کر گرتے نہیں۔ اس طرح انسانوں کے مرنے کی نوبت نہیں آتی۔ کیوں کہ انسان چھتوں اور ملبوں کے نیچے دب کر مرجاتے تھے نہ کہ محض جھٹکے سے۔

یہی معاملہ خود انسانوں کا بھی ہے۔ ہر آدمی اپنے سینہ کے اندر ایک خطرناک زلزلہ چھپائے ہوئے ہے۔ یہ غصہ اور انتقام کا زلزلہ ہے۔ ایک آدمی کو جب دوسرے آدمی سے کوئی ٹھیس پہنچتی ہے، ایک شخص کو جب دوسرے شخص سے کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے سینہ میں انتقام کا زلزلہ آجاتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو قتل کر دیتا ہے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے گھر اور دکان میں آگ لگا دیتا ہے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے نقصان کے درپے ہو جاتا ہے۔

یہ گویا سماجی زلزلہ ہے۔ یہ زلزلہ بھی فطرت کا ایک مظہر ہے۔ ہم اس کے وجود کو مٹانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہاں بھی ہم یہی کر سکتے ہیں کہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچالیں۔ اپنی عقل کو استعمال کر کے اپنے آپ کو اس کی زد میں نہ آنے دیں۔

اس سماجی زلزلہ کے مقابلہ میں حکیمانہ تدبیر کیا ہے۔ ایک لفظ میں، وہ اعراض ہے۔ یعنی ٹکراؤ کے مواقع کو اوائڈ کرنا۔ آپ کو کوئی برا کہے تو اس کا اثر نہ لیجئے۔ کسی کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز کلمہ آپ کے کان میں پڑے تو اس کو سنی ان سنی کر دیجئے۔ کوئی آپ کے کپڑے کے اوپر کیچڑ ڈال دے تو کیچڑ ڈالنے والے سے الجھنے کے بجائے پانی کے نل کے پاس جائیے اور اس کو دھو دیجئے۔ راستہ چلتے ہوئے کوئی شخص آپ کے اوپر کنکری پھینک دے تو اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائیے۔ غرض ناخوشگوار باتوں کو بھلا کر اعتدال کے ساتھ اپنا سفر حیات جاری رکھئے۔

زمینی زلزلے کبھی بند نہیں ہوں گے۔ زمینی زلزلوں کے سلسلہ میں صرف یہ ممکن ہے کہ ہم ان کے نقصان سے اپنے آپ کو بچالیں۔ اسی طرح انسانی یا سماجی زلزلے بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ یہاں بھی جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ کہ ہم اعراض اور برداشت کی تدبیر کو استعمال کر کے اپنے آپ کو ان کی زد میں نہ آنے دیں۔ اپنے آپ کو ان کے نقصانات سے محفوظ رکھیں۔

یہ دنیا مسائل کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو آزادی ہے۔ ایک آدمی جب اپنی آزادی کو بے جا استعمال کرتا ہے تو وہ دوسرے آدمی کے لئے مسئلہ پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک آدمی جب اپنی زبان، اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں کو بے قید طور پر استعمال میں لاتا ہے تو وہ ایسا کرکے دوسرے لوگوں کو مسائل و مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اس کا حل کیا ہے۔ اس کا حل یہ نہیں کہ ہم لوگوں کی آزادی کو ختم کرنے کی مہم چلائیں۔ ایسی مہم بے معنی شور وغل کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیوں کہ لوگوں کو یہ آزادی ان کے خالق نے دی ہے۔ اور جو چیز خود خالق نے دی ہو اس کو ہم لوگوں سے چھین نہیں سکتے۔

ایسی حالت میں مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے تدبیر۔ حکیمانہ اصول پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کے ضرر سے ممکن حد تک اپنے آپ کو بچانا اور اپنی تعمیر کے مواقع تلاش کرکے اس کے حصول میں لگ جانا۔

مثلاً ٹکراؤ سے اعراض کرنا، چھوٹے نقصان کو برداشت کر لینا، اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا، دوسروں سے مطالبہ کرنے کے بجائے خود اپنے استحکام پر توجہ دینا۔ مسائل کو نظر انداز کرکے مواقع اور امکانات کو استعمال کرنا۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں کامیابی کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں جس کے ذریعے کوئی شخص اس دنیا میں کامیابی حاصل کر سکے۔

حکیمانہ تدبیر ہر مسئلہ کا حل ہے۔ حکیمانہ تدبیر ہر نقصان سے بچنے کا یقینی نسخہ ہے۔ آپ حکیمانہ تدبیر کو اپنا اصول بنا لیجئے اور پھر آپ کو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

نوٹ :۔ یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دھلی سے ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو نشر کی گئی۔

Forthcoming publications

1. Woman in Islam and Western Society; 320 pages.
2. Islam: The Creator of Modern Age; 120 pages.
3. Islam: The Voice of Human Nature; 64 pages.
4. Hijab in Islam; 16 pages.

مسائل پر صبر

ایک بستی تھی۔ وہاں کے لوگ بہت تیز زبان تھے۔ وہاں دو آدمیوں نے دکان کھولی۔ ایک نوجوان تھا اور دوسرا بوڑھا۔ نوجوان کی دکان جلد ہی ختم ہو گئی۔ بوڑھے کی دکان چلتی رہی۔ آج وہ اس بستی میں سب سے بڑا دولت مند بنا ہوا ہے۔ اب ہر آدمی اس سے ادب کے ساتھ بات کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نوجوان دکان دار نے جب دیکھا کہ جو گاہک آتا ہے وہ تیز زبان میں بات کرتا ہے تو اس نے لوگوں کی تیز کلامی کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف لوگوں کی تیز کلامی تیز دستی تک پہنچ گئی۔ لوگوں نے اس کو پکڑ کر مارا، یہاں تک کہ وہ دکان بند کر کے وہاں سے بھاگ گیا۔

بوڑھے دکان دار کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس نے لوگوں کی تیز زبان اور درشت کلام کو نظر انداز کیا۔ اس نے اپنی نظر صرف لوگوں کی "جیب" پر رکھی، اور لوگوں کی "زبان" سے اپنی نظر ہٹا لی۔ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی دکان داری میں شاندار کامیابی حاصل کی۔

یہ دنیا کی کامیابی کا واقعہ ہے۔ آخرت کی کامیابی کا اصول بھی یہی ہے۔ آخرت کی کامیابی کے لیے بھی اسی طرح لوگوں کی زیادتیوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص دنیا میں صبر کا طریقہ اختیار نہ کرے اس کے لیے آخرت کی "تجارت" کو کامیاب بنانا ممکن نہیں۔

آخرت کی کامیابی کے لیے اہلِ ایمان کو جو فرض سونپا گیا ہے، وہ دعوت الی اللہ ہے۔ اسی فرض کی انجام دہی پر ان کو وہ کامیابی ملنے والی ہے جس کو آخرت کی جنّت کہا گیا ہے۔ نیز جب اہل ایمان یہ خدائی ذمہ داری ادا کرتے ہیں تو ابتدائی انعام کے طور پر انھیں دنیا میں بھی سربلندی دیدی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ صبر پر قائم نہ ہو سکیں تو وہ دنیا میں بھی محروم رہتے ہیں اور آخرت میں بھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس، ایک لفظ میں، یہ ہے کہ جن باتوں پر انھیں صبر کرنا تھا ان پر وہ لڑ رہے ہیں، اور اس کو غلط طور پر جہاد کہتے ہیں۔ اس دنیا میں لازماً ایسا ہو گا کہ مسلمانوں کو دوسروں کی طرف سے زیادتیوں کا تجربہ ہو گا۔ اہلِ ایمان کو لازماً ایسا کرنا ہے کہ وہ مسائل سے اپنی نظریں ہٹا لیں اور اپنی ساری توجہ صرف فرض کی ادائگی پر لگا دیں۔

اسلام دورِ جدید میں

موجودہ زمانہ کے ماہرین علم الانسان عام طور پر مذہب کا مطالعہ ایک سماجی مظہر کے طور پر کرتے ہیں۔ یہ بات اسلام کے لئے درست نہیں۔ اسلام سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے۔ اسلام ایک الہامی مذہب ہے۔ اور اس بنا پر وہ ابدی طور پر ایک مقدس مذہبی نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لئے اس کی اس مخصوص نوعیت کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ تو بدلتا رہتا ہے۔ پھر بدلے ہوئے زمانہ میں اسلام کا انطباق کس طرح ہوگا۔ اسلام کو تغیّر پذیر دنیا کے مطابق کس طرح بنایا جائے۔ اس کا جواب قرآن اور دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں، مثلاً بائبل، کا مطالعہ کرکے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح لاتعداد تفصیلات کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام زیادہ تر بنیادی قدروں کا مجموعہ ہے اور زمانی تبدیلی کا ٹکراؤ ہمیشہ تفصیلات کے ساتھ پیش آتا ہے نہ کہ بنیادی اقدار کے ساتھ۔

مثلاً اسلام میں توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور توحید ایک اصول کی حیثیت سے بلاشبہ ایک ابدی حقیقت ہے۔ اسی طرح اسلام میں بعض سنگین سماجی جرائم کے لئے مانع سزا (deterrent punishment) کا قاعدہ مقرر کیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس میں حالات کی تبدیلی سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ کم از کم اب تک ایسا فرق حقیقی طور پر ثابت نہیں ہوسکا ہے۔ آج بھی سنگین جرائم کی روک تھام کے لئے مانع سزاؤں کے اصول کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں اصلاح (reform) کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ مگر یہ صرف غلط فہمی کی بنا پر ہے۔ اس سلسلہ میں جو مثالیں دی جاتی ہیں ان کا تعلق خود اسلام سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے اپنے اضافہ سے ہے۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اپنے اضافے سے اسلام کو پاک کرنے کی ضرورت ہے۔

خود اسلام میں اصلاح یا نظر ثانی کی ضرورت اس سے ثابت نہیں ہوتی۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں مسلم علماء کے ایک طبقہ نے مغربی علوم کو پڑھنے کو غیر اسلامی قرار دیا۔ یہ ان علماء کا غلط فیصلہ تھا۔ اس کا کوئی تعلق اسلام سے نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔

یہی معاملہ جمہوریت کا ہے۔ بعد کے زمانہ میں کچھ مسلم قوموں میں بادشاہت کا نظام قائم ہو گیا۔ آج بھی کئی مسلم ملکوں میں ایسا ہی سیاسی نظام پایا جاتا ہے۔ مگر وہ کسی بھی درجہ میں اسلامی تعلیمات کا نتیجہ نہیں۔ وہ ایک سیاسی بگاڑ ہے جو بعد کو مسلم ملکوں میں پیش آیا۔ اسلام کا اصل نمونہ وہ ہے جو رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں قائم ہوا تھا۔ اور یہ ایک معلوم تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کے اس ابتدائی دور میں اعلیٰ ترین جمہوری نظام قائم تھا۔ جس کو قرآن میں شورائی نظام کہا گیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام ہی وہ نظام ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت کی بنیاد پر سیاست کا نظام قائم کیا۔ اس تاریخی حقیقت کو فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں اصلاح کی ضرورت ثابت کرنے کے لئے جو مثالیں پیش کی جاتی ہیں ان کا تعلق اسلام میں اصلاح سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے اپنے عملی انحرافات میں اصلاح سے ہے۔ اس قسم کا عمل یقینی طور پر ضروری ہے۔ مگر ایسا کرنا زیادہ صحیح لفظوں میں، خارجی اور اجنبی اثرات سے اسلام کو پاک کرنا ہوگا نہ کہ خود اسلام کی اصلاح کرنا۔

تاہم زمانہ کی تبدیلی سے حقیقی اسلام کے لئے بھی بعض اوقات مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ مسائل ہیں جن کے لیے اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر یہاں اجتہاد سے مراد اسلام کے حکم کا دوبارہ انطباق (reapplication) ہے نہ کہ اسلام کے اصل احکام میں تبدیلی یا اصلاح۔

مثلاً دور اول کے اسلام میں تاریخوں کے تعین کے لئے چاند کی رویت پر بنیاد رکھی گئی تھی۔ اب فلکیاتی مشاہدہ کے نئے علمی ذرائع دریافت ہونے کے بعد رصد گاہ کے کے ذریعہ کلنڈر کا تعین کیا جائے گا۔ تاہم جیسا کہ عرض کیا گیا یہ اسلام کی اصلاح یا اس کو اپ ڈیٹ

کرنا نہیں ہوگا بلکہ وہ اسلام کے حکم کا از سر نو انطباق ہوگا۔ اس قسم کی مثالوں سے اسلام میں نظر ثانی کے نظریہ کو ثابت کرنا درست نہیں۔

عورت کے بارے میں اسلام کا جو حکم ہے اس کو اکثر اس سلسلہ میں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ قدیم حالات کے زیر اثر اسلام میں عورت کا سماجی رتبہ کم کیا گیا تھا۔ اب نئے حالات میں ضرورت ہے کہ اسلام کی اس غلطی کو درست کیا جائے۔

مگر یہ یقینی طور پر ایک غلط فہمی کا کیس ہے۔ اس موضوع پر میں نے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جو خاتون اسلام کے نام سے چھپ چکی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عورت کے بارے میں اسلام کا جو حکم ہے اس کا تعلق ایک عملی ضرورت سے ہے نہ کہ ایک جنس کو برتر اور دوسری جنس کو کمتر قرار دینے سے۔ اس معاملہ میں جدّت پسند حضرات کا نقطۂ نظر مختصر طور پر equal so equal ہے جب کہ اسلام کا اصول اس معاملہ میں یہ ہے کہ: equal but different

اس معاملہ میں اسلام کی پوزیشن یہ ہے کہ جہاں تک عزت اور احترام کا سوال ہے، اس اعتبار سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں۔ حقوق کے معاملہ میں بھی دونوں کے درمیان برابری کا اصول قائم کیا گیا ہے۔ تاہم عملی زندگی میں دونوں کا مقام عمل (workplace) بنیادی طور پر الگ الگ ہے۔ عورت کا مقام عمل بنیادی طور پر داخل (indoor) ہے اور مرد کا مقام عمل بنیادی طور پر خارج (outdoor) ہے۔

دونوں کے درمیان یہ تقسیم یقینی طور پر افضل اور غیر افضل کی بنا پر نہیں ہے بلکہ حیاتیاتی فرق کی بنا پر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت پیدائشی طور پر نازک جنس ہے۔ اور مرد پیدائشی طور پر سخت جنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے زندگی کے عملی انتظام میں دونوں کے لئے وہ کام دیا گیا ہے جو ان کی پیدائشی ساخت کے مطابق ہو۔ اس قسم کی تقسیم ایک عمومی عملی ضرورت ہے اور وہ ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ حتی کہ وہ عورت اور عورت اور اسی طرح مرد اور مرد کے درمیان بھی اسی شخصی فرق کی بنا پر ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

اسی لئے اسلام میں زندگی کا عملی انتظام مقرر کرتے ہوئے دونوں کے لئے وہ کام دیا گیا ہے جو ان کی پیدائشی ساخت کے مطابق ہو۔ اس تقسیم کا تعلق ہرگز قدامت پسندی سے

نہیں ہے۔ وہ صرف فطرت کا اعتراف ہے۔ فطرت نے پیدائشی طور پر عورت اور مرد میں فرق رکھا ہے۔ یہ فطری فرق اتنا حتمی ہے کہ جن سماجوں میں اس تقسیم کو نظری طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے وہاں بھی فطرت کے دباؤ کے تحت عملاً یہی تقسیم قائم ہے۔

مثلاً مغربی ملکوں میں عورت کو کامل آزادی دینے کے باوجود مذکورہ تقسیم کو ختم نہ کیا جا سکا۔ آج بھی وہاں کے تمام بڑے بڑے خارجی شعبوں میں مرد ہی کا غلبہ ہے۔ عورت کو نسبتہً صرف ہلکے شعبوں میں جگہ ملی ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عورت اپنی پیدائشی ساخت کی بنا پر کمپیوٹر کے نازک کی بورڈ پر تو انگلیاں چلا سکتی تھی مگر عورت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کمپیوٹر فیکٹری میں بھاری بھرکم اور مشقت والے کام کو بخوبی طور پر انجام دے سکے۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں اور کچھ آیتیں متشابہ ہیں۔ اس سے کچھ لوگوں نے یہ مطلب نکالا ہے کہ قرآن کی بہت سی تعلیمات تمثیل اور استعارہ کی زبان میں ہیں اور ان کو حقیقی مفہوم دینے کے لئے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "چور کا ہاتھ کاٹ دو" کے قرآنی حکم کا مطلب ان کے نزدیک لفظی طور پر ہاتھ کاٹنا نہیں ہے بلکہ وہ ایک مجازی اسلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو چوری کرنے سے روک دو۔

محکم اور متشابہہ کے الفاظ سے یہ استدلال درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک قسم کی آیتوں کا تعلق معلوم دنیا سے ہے اور دوسری قسم کی آیتوں کا تعلق غیبی دنیا سے۔

محکم آیتیں معلوم دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ چور کی سزا کا تعلق بھی اسی دنیا سے ہے۔ چنانچہ ایسی آیتوں میں قرآن براہ راست زبان میں کلام کرتا ہے۔

متشابہہ آیتیں وہ ہیں جن کا تعلق غیبی دنیا سے ہے۔ یہاں قرآن نے تمثیل کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ کیوں کہ ایسے امور کو براہ راست اسلوب میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً "خدا کا ہاتھ" کا لفظ جہاں آتا ہے وہ لفظی معنوں میں نہیں ہے۔ اس سے مراد ہاتھ والی صفت ہے۔ یعنی پکڑ کی طاقت۔

اسلام دراصل فطرت کا نظام ہے۔ فطرت کے جو اصول ساری کائنات میں ابدی طور

پر چل رہے ہیں انھیں اصولوں کو انسانی زندگی میں چسپاں کرنے کا نام اسلام ہے۔ جس طرح عالم فطرت کے اصول ابدی ہیں اسی طرح اسلام کے اصول بھی ابدی ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسلام میں نظر ثانی کی بات کرنا اتنا ہی غیر متعلق (irrelevent) ہے جتنا کہ قانون فطرت میں نظر ثانی کا مطالبہ کرنا۔

ایک شبہہ

دوسرے مذاہب کے لوگ نہایت آسانی سے ریفارم کے لیے راضی ہو جاتے ہیں، جب کہ اسلام کے علما ہمیشہ ریفارم کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سے کچھ لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے۔ اس لیے وہ اپنے اندر ریفارم کی اجازت نہیں دیتا۔

اصل یہ ہے کہ اسلام ایک محفوظ اور غیر محرف مذہب ہے، اور دوسرے مذاہب تبدیلیوں کے نتیجہ میں محرف ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کسی ریفارم کا محتاج نہیں، جب کہ دوسرے مذاہب کا معاملہ یہ ہے کہ ریفارم ان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔

مثال کے طور پر بعض مذاہب میں غیر شادی شدہ زندگی کو افضل زندگی بتایا جاتا ہے۔ یہ اصل مذہب میں تحریف ہے۔ اب چونکہ اس تحریف نے ان مذاہب کی نکاح کے بارہ میں تعلیم کو غیر فطری بنا دیا ہے، اس لیے جب ان مذاہب میں ریفارم کی بات کہی جائے تو لوگ فوراً اس کو پسند کرتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کا مذہب ایک غیر فطری اور غیر عقلی تعلیم سے پاک ہو جائے گا۔

مگر اسلام میں اس طرح کی غیر فطری تعلیم موجود نہیں۔ اسلام چوں کہ محفوظ مذہب ہے، اس لیے اس طرح کے اضافات بھی اس میں شامل نہ ہو سکے۔ اس معاملہ میں اسلام اور غیر اسلام کا فرق محفوظ اور غیر محفوظ ہونے کی بنا پر ہے نہ کہ جامد اور غیر جامد ہونے کی بنا پر۔

نیا ہندستان ابھر رہا ہے

بیسویں صدی کے خاتمہ پر ملک کے حالات دوبارہ وہیں پہنچ گئے ہیں جہاں وہ بیسویں صدی کے آغاز میں تھے۔ ان ابتدائی حالات کو استعمال کر کے مہاتما گاندھی نے انڈیا کو پر امن آزادی کا تحفہ دیا۔ اب اگر کچھ باہمت لوگ کھڑے ہو جائیں تو دوبارہ وہ حالات پوری طرح موجود ہو چکے ہیں جن کو استعمال کر کے ملک میں نیا مثبت انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ یہ انقلاب وہی ہے جس کے لئے ہم سب لوگ پچھلے پچاس سال سے انتظار کر رہے ہیں۔ یعنی ایک ترقی یافتہ اور خوش حال انڈیا کی تعمیر۔

موجودہ صدی کے آغاز میں انڈیا میں آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ اس تحریک کا ایک بازو وہ تھا جس کی قیادت مسلم علماء کر رہے تھے اور دوسرا بازو وہ تھا جس کے قائد مسٹر سبھاش چندر بوس تھے۔ تاہم دونوں میں ایک بات مشترک تھی۔ دونوں ہی فوجی طاقت میں اپنے مقاصد کی تکمیل کا راز دیکھ رہے تھے۔ اس فرق کے ساتھ کہ علماء اپنے اس متشددانہ خواب کو ترکی اور افغانستان کی مدد سے پورا کرنا چاہتے تھے اور سبھاش چندر بوس اس متشددانہ خواب کو جاپان اور جرمنی کی مدد سے۔

تاہم نتائج بتا رہے تھے کہ برٹش ایمپائر کی غیر معمولی فوجی طاقت کے مقابلہ میں دونوں ہی غیر مؤثر ثابت ہو رہے ہیں۔ یہی تاریخی وقت ہے جبکہ ۱۹۱۹ میں مہاتما گاندھی ہندستان کے سیاسی نقشہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کا خاص کریڈٹ یہ ہے کہ دوسرے لوگ جس وقت حالات کو صرف اس کی سطح کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، مہاتما گاندھی نے سطح کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو دیکھا اور ان کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔

مہاتما گاندھی نے اپنے یوروپ اور افریقہ کے قیام کے زمانہ میں جدید سیاسی افکار کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے یہ جانا کہ دور جدید میں ایک نئی طاقت ظاہر ہوئی ہے جو اس سے پہلے کبھی انسانی تاریخ میں موجود نہ تھی۔ اور وہ ہے نیشنلزم کا نظریہ۔ موجودہ زمانہ میں خود مغرب کے سیاسی افکار کے نتیجہ میں یہ بات مسلّمہ طور پر مان لی گئی تھی کہ ہر قوم کو حکومت خود اختیاری

کا غیر مشروط حق حاصل ہے۔ مہاتما گاندھی نے اس نئی لہر کو سمجھا اور ہندستان آکر اس کو استعمال کیا۔

مہاتما گاندھی نے کانگرس میں شامل ہونے کے بعد اعلان کیا کہ کانگرس کے لئے انھیں ایک کروڑ روپیہ کا فنڈ اکھٹا کرنا ہے۔ اس کے لئے دو مہینہ تک وہ پورے ملک کا دورہ کریں گے۔ اس وقت بمبئی میں کپاس کے ایک بڑے تاجر عبدالصمد چھوٹانی تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایک کروڑ روپیہ کے لئے دو مہینہ تک سارے انڈیا میں گھومنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو آج ہی ایک کروڑ روپیہ یہیں دے دیتا ہوں۔ مہاتما گاندھی نے سیٹھ چھوٹانی کی پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا: مجھے ہندستانی عوام سے ملنا ہے۔ ایک کرور کا فنڈ جمع کرنا تو محض ایک بہانہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ مہاتما گاندھی ہندستانی عوام کو آزادی کے نام پر موبیلائز کرنا چاہتے تھے۔ وہ پورے ملک میں نیشنلزم کا احساس ابھارنا چاہتے تھے۔ اسی مقصد کے لئے انھوں نے، ظاہری اختلاف کے باوجود، خلافت تحریک سے اتحاد کر لیا تھا۔ مہاتما گاندھی کی مہم کامیاب رہی۔ پورا ہندستان ایک نیشن کے روپ میں جاگ اٹھا جس کا آخری نتیجہ وہ تھا جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو برآمد ہوا۔

مہاتما گاندھی کی پر امن نیشنل تحریک سے پہلے یہ صورت حال تھی کہ ایک طرف ہندستانی لیڈروں کے ہتھیار تھے اور دوسری طرف برٹش امپائر کے ہتھیار۔ اس مقابلہ میں برٹش امپائر کو واضح برتری حاصل تھی۔ چنانچہ وہ ہر ٹکراؤ میں کامیاب رہے۔ مگر مہاتما گاندھی نے نیشنلزم کا جذبہ بیدار کر کے یہ کیا کہ چند لاکھ انگریزوں کے مقابلہ میں انھوں نے کروروں ہندستانیوں کو کھڑا کر دیا۔ پچھلے مقابلہ میں اگر انگریزوں کو برتری حاصل تھی تو اب نئے مقابلہ میں ہندستانیوں کو واضح برتری حاصل ہو گئی۔ اس نئی طاقت کے مقابلہ میں انگریز بے بس ہو گیا۔ آخر کار وہ مجبور ہو گیا کہ ہندستان کو چھوڑ کر یہاں سے چلا جائے۔

یہی معاملہ ایک نئی صورت میں آج دوبارہ پورے ملک میں پیدا ہو گیا ہے۔ ہم ایک دور کو ختم کر کے دوسرے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ بہت سے لوگ اس کو نہ سمجھنے کی وجہ

سے ابھی تک پرانی بولیاں بول رہے ہیں۔ کیوں کہ پچھلے دور کا ملبہ اگر سطح کے اوپر ہے تو نئے دور کے امکانات سطح کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔ آج دوبارہ گاندھیائی نگاہ کی ضرورت ہے جو اوپری سطح سے گزر کر اندر کی لہروں کو دیکھے اور اس کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔

نئے دور اور پرانے دور میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو حدِّ فاصل کی حیثیت حاصل ہے۔ ۶ دسمبر سے پہلے ہندستان کے دو بڑے فرقے، ہندو اور مسلمان، ٹکراؤ کے راستے پر چل رہے تھے۔ آخری زمانہ میں پہنچ کر اس ٹکراؤ کی علامت اجودھیا بن گیا۔ ہندو کی نظریں رام مندر پر اٹک گئیں اور ہر طرف یہ نعرہ سنائی دینے لگا کہ "مندر وہیں بنائیں گے"۔

دوسری طرف مسلمانوں نے بعض نام نہاد قائدین کی غیر دانش مندانہ رہنمائی کے نتیجہ میں ایودھیا کی بابری مسجد کو ملّت کے وقار حتی کہ خود اسلام کی زندگی اور موت کی علامت سمجھ لیا۔ دونوں طرف سے دھواں دھار تحریک چل پڑی۔ ایک طرف اگر رتھ یاترا کی دھوم تھی تو دوسری طرف ریلی اور مارچ کی دھوم۔ ان دو طرفہ تحریکوں نے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں کیا بلکہ ان کے حق میں کسی کا یہ قول مکمل طور پر صحیح ثابت ہوا کہ جلسہ اور جلوس کے ہنگامے گرمی زیادہ پیدا کرتے ہیں اور روشنی کم۔

جیسا کہ معلوم ہے، اس سیاست کا آخری انجام یہ ہوا کہ اجودھیا کی تاریخی بابری مسجد ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو کچھ بپھرے ہوئے ہندوؤں کے ہاتھوں ڈھادی گئی۔ مزید یہ کہ قدیم عمارت کا ملبہ مکمل طور پر وہاں سے ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر تعمیر کر دیا گیا جس میں مورتیاں رکھ کر باقاعدہ پوجا پاٹ کا عمل جاری ہے۔

۶ دسمبر کو جب انہدام کا یہ واقعہ ہوا تو بہت سے لوگوں نے اس کو آغاز سمجھا۔ ان کو اندیشہ ہوا کہ اب ہندستان میں تخریب کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، ایسا پیش نہیں آیا۔ راقم الحروف نے ۶ دسمبر کے حادثہ کے بعد یہ فارمولا پیش کیا تھا کہ اب دونوں فرقوں کو ایسا کرنا چاہئے کہ ایک طرف مسلمان بابری مسجد کے معاملہ پر اپنا ایجی ٹیشن ختم کر دیں۔ اور دوسری طرف ہندو اس کے علاوہ دوسری مسجدوں کے معاملہ کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیں۔

عملی حالات کے اعتبار سے دیکھئے تو آج بطور واقعہ یہی صورت حال قائم ہو چکی ہے۔ ایک طرف مسلم عوام بابری مسجد کے معاملہ پر خاموش ہیں۔ دوسری طرف ہندو عوام اب کسی اور مسجد کے معاملہ کو عملاً بھلا چکے ہیں۔ حتی کہ جو پارٹی "مسجد گراؤ مندر بناؤ" کی تحریک لیکر اٹھی تھی خود اس نے اعلان کر دیا ہے کہ اب اس نے مندر۔ مسجد اشو کو چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ سوشل ریفارم پر اپنی ساری توجہ صرف کرے گی۔

اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ دونوں طرف کے کچھ ناکام لیڈر اپنے وجود کا ثبوت کے لئے کبھی کبھی اخبار میں بیان چھپواتے ہیں یا کسی سرکاری عمارت کے سامنے چند آدمی دھرنا دے کر ظاہر کرتے ہیں کہ مندر۔ مسجد کا اشو ابھی زندہ ہے۔ مگر یہ واقعہ واضح طور پر ان کے دعوے کی تردید کر رہا ہے کہ دونوں فرقوں کے لیڈروں میں سے کوئی بھی کوشش کے باوجود اس میں کامیاب نہ ہو سکا کہ وہ ہندو عوام یا مسلم عوام کو دوبارہ اس مذہبی اشو پر کھڑا کر سکے۔ یا انھیں سڑکوں پر لا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ تخریب کی ایک حد ہے۔ اس دنیا میں ہر تخریب اپنی انتہا پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس دنیا میں جو چیز مسلسل باقی رہنے والی ہے وہ صرف تعمیر ہے نہ کہ تخریب۔ ۶ دسمبر کے بعد فطرت کا یہ قانون ہمارے ملک میں پوری طرح ظاہر ہو چکا ہے۔ اب دونوں فرقوں کے عوام نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ ان کے حقیقی مسائل دوسرے ہیں۔ اور "تصحیح تاریخ" کے نام سے مسجد۔ مندر کا جھگڑا اٹھانا ان حقیقی مسائل کو صرف بڑھانا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں ان کو حل نہیں کرتا۔

یہ حقیقی مسائل کیا ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ملک میں امن ہو۔ ہر ایک کو انصاف ملے۔ ہر ایک کو اپنی تعمیر کے لئے محنت کرنے کے کھلے مواقع حاصل ہوں۔ ملک اقتصادی شعبوں میں ترقی کرے تاکہ ہم دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ایک ترقی یافتہ قوم کا درجہ حاصل کر سکیں۔

قدیم حالات کے ملبہ کے نیچے یہ نئے حالات آج پوری طرح موجود ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ سطح کی چیزوں سے نگاہ کو ہٹا کر اندر کے امکانات کو دیکھا جائے۔ اور انھیں بھر پور طور پر استعمال کیا جائے۔

آج ملک کی تعمیر نو کے لئے حالات پوری طرح سازگار ہیں۔ آسام اور پنجاب کے سرحدی جھگڑے تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ کشمیر میں علیحدگی پسندی کی تحریک دم توڑ رہی ہے، موجودہ حکومت کی لبرلائزیشن کی پالیسی کے نتیجہ میں ہندستان دوبارہ انٹرنیشنل نقشہ پر نمایاں ہو رہا ہے۔ حالیہ انتخابات نے بتایا ہے کہ ہندستان کا ووٹر اب نعروں کے فریب میں آنے والا نہیں ہے۔ وہ اب حقیقی اشوز کو اہمیت دے گا نہ کہ جذباتی نعروں کو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ جھگڑے جو آزادی کے بعد سے مسلسل جاری تھے، وہ اب اجودھیا کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن ہو چکے ہیں۔

یہ سب انقلابی تبدیلیوں کی علامتیں ہیں۔ اب برصغیر میں ایک نیا ہندستان ابھر رہا ہے۔ نئے ہندستان کے بننے کا آغاز ہو چکا ہے۔ اور فطرت کا یہ قانون ہے کہ جس عمل کا آغاز ہو جائے وہ اپنی تکمیل کی منزل تک بھی ضرور پہنچے۔ اور ہندستان یقینی طور پر اس عمومی قانون میں کوئی استثنار نہیں۔

لفظ اور معنی

قدیم عرب میں بہت سے بُت تھے ۔ ایک بڑے بت کا نام " منات " تھا ۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عرب کا منات اور ہندستان کا سومنات دونوں ایک ہی دیوتا کے دو نام ہیں ۔ حالانکہ صوتی مناسبت کے سوا اس نظریہ کے حق میں کوئی تاریخی دلیل موجود نہیں ۔

اسی طرح بعض عرب سیاح جب ہندستان آئے اور انھوں نے یہاں " برھما " کا لفظ سنا تو انھوں نے یہ خیال قائم کرلیا کہ برھما اور ابراہیم دونوں کی اصل ایک ہے ، اور ہندستان کے برہمن " ابراہیم " کی اولاد ہیں ۔ علامہ شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں اس مسئلہ پر کلام ہے اور لکھا ہے کہ یہ محض ایک خیالی بات ہے ، اس کے حق میں تاریخی شواہد موجود نہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کا تعلق علم سے یا علمی استدلال سے نہیں ۔ یہ شاعری کی اس صنف کو تاریخ میں استعمال کرنے کی کوشش ہے جس کو " مناسبتِ لفظی " کہا جاتا ہے ۔

مناسبت لفظی کا یہ طریقہ صرف لطیفہ گو لوگوں کے یہاں رائج نہیں ۔ بہت سے لوگ حقیقی معاملات میں بھی اس طریقہ کو اختیار کیے ہوئے ہیں ۔ کوئی شخص ایک مذہبی نظریہ گھڑتا ہے اور اس کے حق میں اس قسم کی لفظی دلیل دے کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی بات کو آخری طور پر ثابت کر دیا ہے ۔ کوئی شخص ایک سیاسی پروگرام بناتا ہے اور اس پر پوری ایک قوم کو دوڑا دیتا ہے ۔ حالاں کہ اس سیاسی پروگرام کے حق میں ایک لفظی نکتہ کے سوا کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں ہوتی ۔

الفاظ کے مجموعہ سے معنویت کا خزانہ برآمد نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح اس قسم کی تحریکوں اور اس قسم کے ہنگاموں کا کوئی حقیقی نتیجہ نہیں نکل سکتا ۔ اور نہ اب تک ان کا کوئی نتیجہ نکلا ہے ۔

یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے ۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ لفظی نکتوں اور معنوی حقیقتوں میں فرق کرے ۔ وہ لفظی نکتوں کی بنیاد پر کوئی پروگرام نہ بنائے ۔ بلکہ حقائق کی بنیاد پر غور و فکر کے بعد اپنا پروگرام ترتیب دے ۔

حقیقی کلام وہ ہے جو مناسبت معنوی پر مبنی ہو نہ کہ مناسبت لفظی پر ۔ سچا عمل وہ ہے جو حقائق کی بنیاد پر انجام دیا جائے نہ کہ تخیلات کی بنیاد پر ۔

یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس قسم کے سیکڑوں عرب نوجوان مختلف عرب ملکوں میں پیدا ہو چکے ہیں جو الرسالہ مشن سے شیفتگی کی حد تک تعلق رکھتے ہیں ۔ الرسالہ مشن اردو میں جاری ہوا ۔ اس کا لٹریچر زیادہ تر اردو زبان میں ہے ۔ یہ عرب نوجوان اردو سے مکمل طور پر ناواقف ہیں ، اس کے باوجود انھوں نے الرسالہ مشن کو جتنا زیادہ سمجھا ہے اور جتنا اس کو پایا ہے ، اس کی مثال اردو داں لوگوں میں بھی مشکل سے ملے گی ۔

ان عرب نوجوانوں میں ایک قابل لحاظ تعداد ایسے نوجوانوں کی ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کے لئے وقف کر دی ہیں ۔ اور مختلف ملکوں میں خاموشی کے ساتھ اس مشن کو پھیلانے میں مصروف ہیں ۔ اس قسم کا ایک بڑا حلقہ قاہرہ میں ہے ۔ وہ لوگ الرسالہ کے منتخب مضامین کا عربی میں ترجمہ کرواتے ہیں اور اس کو پمفلٹ کی صورت میں چھاپ کر عربوں کے درمیان پھیلا رہے ہیں ۔ انگلینڈ میں مقیم عرب نوجوان یہی کام انگریزی کتابچوں کی صورت میں کر رہے ہیں ۔ اسی طرح اور کئی ملک میں یہ کام خالص مثبت انداز میں جاری ہے ۔

العارف عبدالسلام احمد (۳۳ سال) ایک عرب نوجوان ہیں ۔ ان کی تعلیم برطانیہ (Red Car, Middlesborough) میں ہوئی ۔ انھوں نے بتایا کہ ۲ اگست ۱۹۹۲ کو وہ لیسٹر میں تھے ۔ وہاں مشہور مصری عالم دکتور محمد صلاح الصاوی ایک مؤتمر میں اپنا مقالہ پیش کرنے کے لئے آئے تھے ۔ وہاں ایک پاکستانی نوجوان ان سے بحث کرنے لگا کہ اسلام کی حاکمیت قائم کرنا امت پر فرض ہے اور یہی امت مسلمہ کا نصب العین ہے ۔ دکتور صاوی نے کہا : الحاکمیة لیست بآیة ولا حدیث ولکنها اجتهادُ بشرٍ عُرضة للخطأ (حاکمیت کا لفظ نہ آیت ہے اور نہ حدیث ۔ بلکہ وہ ایک انسان کا اجتہاد ہے جو غلطی کا شکار ہو سکتا ہے)

وگن میں مجھے دکتور صلاح الصاوی کی کتاب قضیة تطبیق الشریعة فی العالم الاسلامی ملی ۔ اس کے باب رابع کا عنوان ہے : اجماع الامة علی کفر من أبی التحاکم الی الکتاب و السنة ۔ اس باب میں دکتور یوسف القرضاوی کا ایک اقتباس ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے :

بل ان العلمانی الذی یرفض مبدأ تحکیم الشریعة من الاساس لیس له من الاسلام الا اسمه ۔ وهو مرتد عن الاسلام بیقین ۔ یجب ان یستتاب وتزاح عنه

الشبهة وتقام عليه الحجة۔ والاحكم القضاء عليه بالردة وجُرِّد من انتماءه الى الاسلام او سحبت منه الجنسية الاسلامية ۔ وفرق بينه وبين زوجه وولده۔ وجرت عليه احكام المرتدين المارقين فى الحياة وبعد الوفاة (صفحہ ۴۶)

علمانی (سیکولر) کا مذکورہ حکم اس وقت ہے جب کہ علمانیت (سیکولرزم) کو ایک اعتقادی چیز مانا جائے۔ مگر سیکولرزم اصلاً ایک عملی تدبیر ہے۔ سیکولرزم کا عمومی مطلب یہ ہے کہ کثیر مذہبی سماج میں ریاست اس بات کی پابندی قبول کرلے کہ وہ مذہبی امور میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرے گی۔ گویا سیکولرزم صرف ایک سیاسی مسلک ہے نہ کہ کوئی مذہبی عقیدہ۔

۱۹ ستمبر کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں جس مکان میں ٹھہرا تھا، اس کے پیچھے ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ کسی نے اس کا شیشہ توڑ دیا ہے۔ میں نے جاکر دیکھا تو ڈرائیور کی سیٹ کے پاس والا کھڑکی کا شیشہ مکمل طور پر ٹوٹ گیا تھا اور اس کے ٹکڑے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں بے روزگار لڑکے اکثر اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ یہ لڑکے عام طور پر شراب اور ڈرگ کے عادی ہو جاتے ہیں۔ جب ان کے پاس اپنی بری عادتوں کو پورا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تو وہ چوری کرتے ہیں۔ مذکورہ گاڑی کا شیشہ کسی لڑکے نے اس لئے توڑا تھا کہ وہ اس کے اندر لگے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو نکال لے اور پھر اس کو بیچ کر کچھ رقم حاصل کرے۔

جدید مغربی زندگی میں جہاں بہت سی مادی اور اخلاقی خوبیاں ہیں، ان میں بعض ایسی برائیاں پائی جاتی ہیں جن کا مشاہدہ مشرقی ملکوں میں نہیں ہوتا۔ یہاں کی سڑکوں پر چلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ مکانوں کے سامنے برائے فروخت (for sale) کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس وقت برطانیہ میں اقتصادی گراوٹ (recession) کا دور ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنے مکانوں کی قسط بینکوں کو ادا کرنے میں اپنے کو عاجز پا رہے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے مکانوں کو اپنے بینکوں کے حوالے کردیا ہے تاکہ وہ کسی اور گاہک کو تلاش کرکے مکان ان کے حوالے کرسکیں۔

واضح ہو کہ یہاں مکانات عام طور پر بینکوں کے قرض کی بنیاد پر خریدے جاتے ہیں۔

ایک انگریز سے گفت گو کے دوران میں نے پوچھا کہ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کو اپنے

موجودہ حالات میں ذہنی سکون حاصل ہے :

Do you feel you are enjoying mental peace.

اس نے مسکرا کر کہا کہ ہماری زندگی اتنی زیادہ مشینی ہو چکی ہے کہ ہمارے لئے یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں ہم میں سے اکثر لوگوں کو شاید ہی کبھی یہ موقع ملتا ہو کہ وہ آپ جیسے لوگوں کی طرح فلسفیانہ انداز میں سوچیں کہ انھیں پیس آف مائنڈ حاصل ہے یا نہیں۔

ترقی کے ساتھ بے ترقی کا کیسا عجیب نمونہ مغربی ملکوں میں پایا جاتا ہے۔

برطانیہ میں آپ جس سڑک یا جس مقام پر نکلیں ہر جگہ کتوں کا منظر دکھائی دے گا۔ مرد اور عورت کتے کی رسی اپنے ہاتھ میں لے کر چلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ۲۰ ستمبر کو میں نے ایک تعلیم یافتہ انگریز سے کہا معاف کیجئے، کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ کتوں سے کیوں اتنا زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

انگریز کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد بولا۔ میں نے فرانس کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ فرانس میں سات ملین آدمی کتا پالے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کا ایک سروے کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاندانی انتشار اور انڈسٹریل انقلاب کے نتیجہ میں لوگوں نے انسان کے اندر اپنا اعتماد کھودیا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ بیٹا اور بیٹی بھی ان کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ جب کہ کتا اپنی وفاداری کی فطرت کی بنا پر انھیں یہ اعتماد دے رہا تھا۔ کتے کے اندر وہ اپنی اس مطلوب چیز کو پا رہے تھے جس کو وہ موجودہ انسان حتیٰ کہ اپنے عزیزوں میں بھی نہیں پاتے۔ اس لئے وہ اپنی مطلوب فطرت کی تسکین کے لئے کتا پالنے لگے ہیں۔ پھر اس نے مسکرا کر کہا کہ یہی معاملہ غالباً برطانیہ کے لوگوں کا بھی ہے۔

میں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ کتا ری ایکٹ نہیں کرتا، جب کہ انسان ری ایکٹ کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کتا انسان کے مقابلہ میں ایک غیر اختیاری مخلوق ہے۔ انسان با اختیار مخلوق ہونے کی وجہ سے ری ایکٹ کرتا ہے جو آپ کے لئے ناگوار ہے۔ جب کہ کتا اس طرح ری ایکٹ نہیں کرتا اس لئے اس کے اور آپ کے درمیان کامپلکس پیدا نہیں ہوتا۔

پھر میں نے قرآن کی آیت افغیر دین اللہ یبغون و لہ اسلم من فی السماوات والارض

طوعاً وکرھاً کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی اسکیم میں انسان اور حیوان دونوں سے ایک ہی دین کی پیروی مطلوب ہے، اس فرق کے ساتھ کہ جس اصول کی پیروی حیوان جبلت (instinct) کے تحت مجبورانہ کر رہے ہیں، اس دین کی پیروی انسان اختیارانہ کرنے لگے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ اسلام کا مطلب دراصل دین فطرت کی پیروی ہے۔ اگر انسان اسی طرح دین فطرت پر آجائے جس طرح حیوان دین فطرت پر قائم ہے تو اس کے بعد انسان سے ری ایکشن کا طریقہ چھوٹ جائے گا۔ اس کے بعد انسان بھی آپ کے لئے محبوب بن جائے گا جس طرح حیوان آپ کے لئے محبوب بنا ہوا ہے، کیوں کہ انسان ہر اعتبار سے حیوان کے مقابلہ میں افضل ہے۔ مثلاً ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خیالات کا اکسچینج ہوتا ہے، جب کہ انسان اور حیوان کے درمیان اس قسم کا اکسچینج ممکن نہیں۔

دسمبر ۱۹۹۱ میں مانچسٹر میں ایک بڑی اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف ملکوں کے علماء شریک ہوئے۔ اس کا موضوع الاسلام والنظام العالمی الجدید تھا۔ طارق حسین الکمدی (۳۰ سال) مانچسٹر کے قریب وگن میں رہتے ہیں۔ وہ موتمر میں شریک نہیں تھے۔ البتہ اس کا ویڈیو ٹیپ انھوں نے دیکھا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک عرب محاضر نے اپنے محاضرہ میں بتایا کہ مغرب اسلام کا دشمن ہے۔ وہ اسلام کو تباہ کر دینا چاہتا ہے (ان الغرب یرید تدمیر الاسلام) محاضرہ کے بعد حاضرین میں سے ایک نوجوان کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ آپ کہتے ہیں مغرب اسلام کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمارے لئے کیسے یہ ممکن ہوا کہ ہم ایک مغربی ملک میں اتنے بڑے پیمانہ پر موجودہ اسلامی کانفرنس اور اس طرح کی دوسری کانفرنسیں منعقد کریں۔ محاضر نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم اس راز کو نہیں جانتے۔ یہ مغرب کی ایک گہری چال ہے۔ یہ مغرب کی فراخ دلی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی سوچی سمجھی اسٹریٹجی کا نتیجہ ہے۔

میں نے اس قصہ کو سنا تو میں نے کہا کہ استغفر اللہ۔ محاضر اگر واقعی اسلام پسند تھے تو اس سوال کے بعد انھیں ڈھ پڑنا چاہئے تھا اور چیخ کر کہنا چاہئے تھا: کل الناس اعلم منی حتی العجائز سیدنا عمر کی یہ سنت بتاتی ہے کہ مومن کا مزاج کیا ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے کہ جب اس کی غلطی بتائی

تو وہ اس کے عدم اعتراف کو افورڈ نہ کر سکے۔ میں نے کہا: المومن لا یستطیع ان یتحمل عدم الاعتراف۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا: حارب۔ میں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک بات عرض کروں۔ پھر میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کا نکاح علی ابن ابی طالب سے کیا۔ ان کے یہاں ایک بچہ کی ولادت ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے پوچھا کہ اس کا نام کیا رکھا۔ انھوں نے کہا حرب۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں اس کا نام حسن رکھو۔

میں نے کہا کہ آپ کا نام ما انا علیہ واصحابی کے خلاف ہے۔ جس نام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رد کر دیا اس کو آپ دوبارہ پسند کر رہے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تاریخ میں دورِ حرب ختم ہوا، اور دورِ امن شروع ہوا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم زعماء اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ رسول اور اصحاب رسول نے اپنی قربانیوں سے دورِ حرب کو ختم کرکے تاریخ انسانی میں دورِ امن شروع کیا۔ اور یہ مسلم زعماء دوبارہ تاریخ انسانی میں دورِ حرب واپس لانا چاہتے ہیں۔

۲۰ ستمبر کو عرب نوجوانوں کی ایک مجلس میں سورۃ النساء کی آیت ۱۰۲ کے بارہ میں سوال کیا گیا۔ اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس دنیا میں کبھی یکساں حالات نہیں ہو سکتے۔ یکساں حالات صرف جنت کے ماحول میں ممکن ہیں۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے اس لئے یہاں ہمیشہ نشیب و فراز کے حالات پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس لئے قرآن وسنت میں ہر طرح کے احکام ہیں تاکہ اہل اسلام اپنے آپ کو جن حالات میں پائیں اس کے مطابق عمل کر سکیں۔

مثلاً اس دنیا میں اہل ایمان کو کبھی مسجد میں معتدل حالات میں نماز پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انھیں جنگ کے میدان میں نماز پڑھنا پڑتا ہے۔ اس لئے قرآن و حدیث میں اگر عام حالات میں نماز کی ادائگی کا حکم بتایا گیا تو اسی کے ساتھ جنگ کے میدان کے لئے صلاۃ خوف کا حکم بھی بتا دیا گیا۔

پھر میں نے کہا کہ مسلمانوں کے لئے موجودہ دنیا میں مختلف حالات ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے

سنت رسول کا مطالعہ کیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی وسیع تر تقسیم میں تین قسموں میں نظر آئے گی۔ اول، مکی دور۔ یہ وہ دور ہے جب کہ اہل اسلام کے ہاتھ میں سیاسی قوت نہیں تھی۔ دوم مدنی دور کا نصف اول۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مدینہ میں دو متوازی نظام قائم تھا۔ اس کا اقرار صحیفہ مدینہ میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے: للیہود دینہم وللمسلمین دینہم۔ سوم، مدنی دور کا نصف ثانی۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ماحول میں اہل اسلام کا غیر مشترک اقتدار قائم ہو گیا۔

میں نے کہا کہ سورہ النساء کی مذکورہ آیت (یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت) مدنی دور کے نصف اول والے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ آج اکثر ملکوں میں یہی صورت حال ہے۔ مثلاً برطانیہ میں ایک طرف برٹش کورٹ ہے۔ دوسری طرف مساجد اور اسلامی مراکز کے علماء ہیں جن کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ العلماء ورثۃ الانبیاء۔ برٹش کورٹ گویا کعب بن اشرف کے مماثل ہے۔ اور علماء (یا دار الافتاء) رسول کے نمائندہ۔ اب مذکورہ آیت کے مطابق مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ ان کے درمیان جب کوئی نزاع پیدا ہو تو وہ اپنے معاملہ کو ملکی عدالت میں نہ لے جائیں۔ بلکہ علماء یا دار الافتاء کے سامنے رکھ کر اس کا شرعی فیصلہ کریں اور قرآن وسنت کی روشنی میں جو فیصلہ دیا جائے اس کو بے چون وچرا تسلیم کرلیں۔

لندن میں مقیم ایک ہندستانی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے میں آپ کا رسالہ پڑھتا تھا۔ مگر اب میں نے اس کو پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے خلاف کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور آپ کے خلاف مضامین چھپ رہے ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد میں آپ کے مشن کے بارہ میں مشتبہ ہو گیا اور آپ کی تحریروں کو پڑھنا چھوڑ دیا۔

میں نے کہا کہ مخالفانہ مضامین تو ہر ایک کے خلاف لکھے گئے ہیں۔ تبلیغی جماعت جیسی بے ضرر جماعت کے خلاف بھی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ حتی کہ اکابر میں سے کوئی بھی شاید ہی اس قسم کی تحریروں سے بچا ہو۔ اس وقت میرے پاس محمد سرور بن نایف زین العابدین کی کتاب الحکم بغیر ما انزل اللہ واھل الغلو تھی۔ یہ کتاب دار القلم، برمنگھم (Tel. 021-449 4422) نے چھاپی ہے۔ میں نے اس کا صفحہ ۲۰۸ دکھایا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے امام النووی کے بارہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی شرح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، حضرت ابوذر پر اور اسلام پر

جھوٹ باندھا ہے (لقد کذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی ابی ذر وعلی الاسلام) اس کو دکھانے کے بعد میں نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہوگا کہ اس الزام کو دیکھنے کے بعد آپ امام نووی کی کتابیں پڑھنا چھوڑ دیں۔

ایک عرب نوجوان نے کہا کہ "قرآن عرب کی زبان میں اترا ہے" میں نے کہا کہ یہ نہ کہئے، بلکہ یہ کہئے کہ قرآن انسان کی زبان میں اترا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ قرآن عربوں کی زبان میں اترا ہے تو آپ قرآن کے ۵۰ فیصد معانی سے محروم رہ جائیں گے۔

برطانی نومسلموں کے بارہ میں ایک کتاب نظر سے گزری۔ اس میں برطانی نومسلموں کے تاثرات ان کی تصویروں کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں۔ اس کا نام و پتہ یہ ہے :

Islam Our Choice, compiled by Dr S.A. Khulus,
The Woking Muslim Mission & Literary Trust,
The Shah Jehan Mosque, Woking, Surrey, England.

۳۶۰ صفحہ کی اس کتاب میں سیکڑوں نومسلموں کے تاثرات نقل کئے گئے ہیں۔ کچھ لمبے ہیں اور کچھ صرف چند سطروں پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۱۳۹ پر جیوٹ ٹائلر (Geo T. Tyler) کا ایک مختصر اقتباس ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے کہ میں نے مقدس قرآن کا مطالعہ کیا۔ اسلام ایک صاف اور خوبصورت مذہب ہے۔ وہ نجات کو اپنی محنت کا نتیجہ قرار دیتا ہے نہ کہ ایک خدا کے بیٹے کے سولی پر چڑھنے کا نتیجہ :

I studied the Holy Qur'an. Islam is a clean, wholesome faith and makes the salvation of man his own duty, and not dependent on the sacrifice of a 'Son of God.' (p. 139)

مانچسٹر میں ایک مسیحی فادر سے میری گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے مذکورہ بات پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کے سوا تمام دوسرے مذاہب محرف ہو چکے ہیں۔ یہ تو گویا خدا کو بلیم دینا ہے۔ کیوں کہ یہ آپ لوگ بھی مانتے ہیں کہ وہ مذاہب خدا کی طرف سے آئے۔ پھر جب وہ خدائی مذہب تھے تو خدا نے کیسے گوارا کیا کہ اس کے بھیجے ہوئے تمام مذاہب محرف ہو جائیں اور صرف ایک غیر محرف مذہب دنیا میں باقی رہے۔

میں نے کہا کہ یہ خدا کی ایک نعمت ہے جو اس نے اپنے بندوں پر کی ہے۔ اس طرح اس نے یہ انتظام کر دیا کہ ہمارے لئے چوائس کا مسئلہ نہ رہے۔ ہم کو یہ سوچنا نہ پڑے کہ یہ مذہب صحیح ہے یا وہ مذہب صحیح ہے۔ میدان میں ایک ہی صحیح مذہب ہو اور کسی فتنہ میں مبتلا ہوئے بغیر ہم اس واحد صحیح مذہب کو اختیار کر لیں۔ اس طرح خدا نے ہم کو ایک نازک امتحان سے بچا لیا ہے جس پر ہمیں اس کا شکرگزار ہونا چاہئے۔

۲۱ ستمبر کی صبح کو میں ایک عرب نوجوان کی رہنمائی میں وگن کی مسجد میں گیا۔ یہ یہاں کی واحد مسجد ہے اور اس کا نام مسجد طوبیٰ ہے۔ یہ ہال کی مانند ہے۔ میں نے اس کے احاطہ کی پیمائش کی تو لمبائی میں وہ ۶۱ قدم اور چوڑائی میں ۴۵ قدم تھی۔ مسجد سادہ مگر خوبصورت تھی۔ اس کے اندر عربی کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود تھا۔ کئی الماریوں میں قرینہ کے ساتھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں ابن الجوزی البغدادی (597-508 ھ) کی تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر (نو جلد) بھی موجود تھی۔ اس کو المکتب الاسلامی (ص ب 11/3771، بیروت) نے ۱۹۸۴ء میں اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ جس میں نماز ادا کی جاتی ہے وہ لمبائی میں ۲۵ قدم اور چوڑائی میں ۱۲ قدم تھا۔

مسجد میں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی۔ نماز کے بعد کی دعا کے دوران میں نے کہا: رَبِّ لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ حالت سفر میں نکلے تھے۔ میں بھی اس وقت حالت سفر میں ہوں۔ اسی اشتراک کی بنا پر بے اختیارانہ یہ الفاظ زبان پر جاری ہو گئے۔

مجھے بتایا گیا کہ یہاں ابتداءً چرچ تھا۔ چرچ والوں نے اس کو فروخت کر دیا۔ اس کے بعد یہ عمارت ایک انگریز کی ملکیت میں چلی گئی۔ بعد کو اس انگریز نے اس کو فروخت کرنا چاہا۔ مقامی مسلمانوں نے تقریباً ۲۰ ہزار پونڈ مسجد کے لئے جمع کئے تھے۔ انھوں نے چاہا کہ اس عمارت کو خرید کر اس کو مسجد کی صورت دے دیں۔ مگر عین اسی وقت ایک اور انگریز خریدار پیدا ہو گیا۔ وہ دگنا قیمت ۴۰ ہزار پونڈ دینے کے لئے تیار تھا۔ مگر جب عمارت کے مالک کو جو مسیحی تھا، یہ بتایا گیا کہ مسلمان اس کو خرید کر وہاں مسجد بنانا چاہتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور انگریز کو ۴۰ ہزار پونڈ میں دینے کے بجائے مسلمانوں کو صرف ۲۰ ہزار پونڈ میں دے دیا۔ ایسا ہی ایک اور قصہ لندن میں میرے علم

میں آیا۔

مذکورہ مسیحی نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے کہا کہ یہ عمارت پہلے ایک عبادت خانہ تھی۔ اس لئے اس کا سب سے بہتر استعمال یہ ہے کہ اس کو دوبارہ عبادت خانہ بنایا جائے۔ اس لئے میں اس کو کم قیمت کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کر رہا ہوں۔ کیوں کہ انھوں نے بتایا کہ وہ اس کو عبادت خانہ بنانا چاہتے ہیں۔

۲۲ ستمبر کو ایک برطانی نومسلم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پچھلے سال اسلام قبول کیا ہے۔ میں نے ان سے تعلیم کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے یہاں میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی دوران انھیں اسلام سے واقفیت ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے تعلیم چھوڑ دی اور اسلام میں سرگرم ہو گئے۔

میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی دریافت نے آپ کے اندر ایک نیا جوش پیدا کیا اور اسلام کو سیکھنے کا جذبہ آپ کے اندر ابھر آیا۔ مگر یہ کام آپ کو ساتھ ساتھ کرنا چاہئے۔ یعنی تعلیم اور تربیت دونوں کی طرف توجہ دینا چاہئے۔ آپ ایک طرف کالج اور یونیورسٹی میں اپنی تعلیم مکمل کریں اور اسی کے ساتھ مساجد اور اسلامی مراکز سے وابستہ ہو کر اسلامی تربیت اور اسلامی معلومات حاصل کریں۔ آپ ابھی ابتدائی عمر میں ہیں۔ آپ کو اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ آپ کو اپنے سامنے دو نشانہ رکھنا چاہئے نہ کہ صرف ایک نشانہ۔

اس گفتگو کے وقت ایک عرب نوجوان ریاض عبد السلام احمد (۲۸ سال) موجود تھے۔ وہ برطانیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ انھوں نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ عربوں میں ایک مثل ہے کہ ایک پتھر سے دو گوریا کا شکار کرو (یضرب عصفورین بحجر واحد) میں نے کہا کہ یہ نہایت صحیح مثل ہے اور آپ لوگوں کو اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ یعنی تعلیم اور تربیت دونوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہئے، نہ یہ کہ تعلیم کو چھوڑ کر آپ صرف تربیت کے لئے دوڑنا شروع کر دیں۔

اس وقت مجلس میں کئی عرب نوجوان تھے۔ میں نے معاملہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے: واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل

ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم (الانفال ۶۰) اس آیت میں ترھبون کا لفظ بیحد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت کے اندر ارہاب کی صفت ہونی چاہئے۔ گویا قوت وہ ہے جو قوت مرہبہ ہو۔

میں نے کہا کہ اس وقت عالم اسلام میں بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ کیا اہل عالم اس سے خوف زدہ ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بعض نادان لوگ یورپ یا امریکہ کے کسی اخبار میں مسلم فنڈمنٹلزم یا صحوۃ اسلامیہ کے خلاف کوئی مضمون پڑھ کر کہتے ہیں کہ دیکھو، مغرب ہماری ان سرگرمیوں سے خوف زدہ ہے۔ میں نے ایک امریکی سے ایک بار اس بارہ میں گفت گو کی۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ کم سے کم کوئی ازعاج (nuisance) تو پیدا کر ہی سکتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہم کو کیا درجہ دے رہے ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ ہمیں موجودہ دور کو سمجھنا چاہئے۔ اس دور میں جو چیز قوت مرہبہ کی حیثیت رکھتی ہے وہ صرف علم ہے۔ خاص طور پر سائنسی علم۔ اس لئے اس آیت کے مطابق، مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ وقت کی قوت مرہبہ (علم) حاصل کریں۔ اس کے بغیر موجودہ دنیا میں ہم کو باوزن حیثیت نہیں مل سکتی۔

ستمبر ۱۹۹۲ کی ۲۳ تاریخ ہے۔ میں وگن میں اپنی قیام گاہ کے اوپر کے کمرہ میں بیٹھا ہوں۔ یہ مکان ایک شاہراہ کے کنارے واقع ہے۔ سڑک پر دونوں طرف گاڑیوں کا لامتناہی سیلاب بہہ رہا ہے سامنے تکونی چھتوں (۸) کے مکانات کی قطاریں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک طرف پارک ہے جس میں دور تک درختوں کا منظر پھیلا ہوا ہے۔ اپنی کھڑکی سے ان مناظر کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ یہی وہ قوم ہے جو کبھی برطانیہ عظمی کہی جاتی تھی۔ اس نے دنیا کے اتنے بڑے حصہ میں اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا کہ کہا جانے لگا کہ اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا۔

میں سوچنے لگا کہ آخر اس قوم کی وہ کون سی صفت تھی جس نے اس کو اتنے وسیع رقبہ میں اتنی بڑی سلطنت قائم کرنے کے قابل بنایا۔ اتنے میں سڑک پر ایک معمر خاتون ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے جسم پر سبز رنگ کا کپڑا ہے۔ اپنے ہاتھ میں وہ لاٹھی جیسی ایک لمبی لکڑی لئے ہوئے ہے۔ اس لکڑی کے سرے پر ایک گول تختہ جڑا ہے۔ اس تختہ پر جلی حرفوں میں نیچے اوپر لکھا ہوا ہے:

Stop/Student

یہ معمر خاتون اس نشان کو لے کر سڑک کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے اسکول کے بچے جو سب کے سب سفید فام ہیں، تیزی سے سڑک کو پار کرتے ہیں۔ خاتون اپنا یہ کام سڑک کی دونوں سائڈ ہیں کرتی ہے اور پھر تیزی سے اپنی لکڑی کا رخ الٹا کر کے دوبارہ سڑک کے کنارے کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ مزید آنے والے بچوں کی مدد کر سکے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں سڑکوں پر جگہ جگہ یہ انتظام کیا گیا ہے۔ کم آمدنی والی معمر خواتین معمولی معاوضہ پر یہ کام کرتی ہیں۔ ان کے جسم کا سبزی مائل کپڑا ان کی اس حیثیت کی علامت ہوتا ہے۔ صبح کے وقت جب بچے اسکول جاتے ہیں اور دوپہر بعد جب وہ لوٹتے ہیں، دونوں وقت یہ خواتین سڑک پر آکر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان کے نشان کو دیکھ کر تمام سواریاں فوراً رک جاتی ہیں۔ ایسی خاتون کو اسکول کراسنگ گارڈ کہا جاتا ہے۔

مذکورہ خاتون کو اپنے کام کی ادائگی میں بیک وقت دو پہلوؤں کا لحاظ کرنا تھا۔ ایک طرف گاڑیوں کا اور دوسری طرف بچوں کا۔ بوڑھی خاتون نے اس کام کو اتنی پھرتی، اتنی باقاعدگی اور اتنے منظم انداز میں کیا کہ میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ انگریزوں کی عالمی کامیابی کا راز یہ تھا کہ انھوں نے اپنی پوری قوم، حتی کہ عام مردوں اور عورتوں تک کے اندر ڈسپلن کی صلاحیت کمال درجہ میں پیدا کر دی۔

دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹) کے دوران سرونسٹن چرچل برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ وہ عام طور پر شدت پسند لیڈر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مگر ان کی زندگی میں بہت سی قابل قدر مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بوڑھے برطانی شخص نے مجھے بتایا کہ چرچل نے دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں برطانی قوم کو جو ماٹو دیا وہ یہ تھا —— سب کچھ میرے اوپر منحصر ہے:

It all depends on me.

یہ بلاشبہ ایک بہترین ماٹو ہے۔ یہ جنگ اور امن دونوں حالتوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ میرے بھائی عبد المحیط خاں انجینئر نے بتایا کہ ایک بار وہ چنڈی گڑھ کے ایک ٹریننگ کیمپ میں شریک ہوئے۔ یہ کیمپ پالی ٹکنیک کے پرنسپلوں کی ٹریننگ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اور ایک انگریز پروفیسر کو اس میں لکچر دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس کا افتتاح ایک ہندستانی منسٹر کو کرنا تھا۔

منسٹر صاحب جب مائک پر آئے تو اچانک بجلی چلی گئی اور لاؤڈ اسپیکر نے کام کرنا بند کر دیا۔ جلسہ گاہ میں متبادل انتظام کے طور پر بیٹری رکھی نہیں گئی تھی۔ البتہ کالج کے قریبی ورک شاپ میں بیٹری موجود تھی۔

جب یہ حادثہ ہوا تو زیر تربیت پرنسپل صاحبان کالج کے کسی چپراسی یا کسی ورکر کو تلاش کرنے لگے تاکہ اس کو بھیج کر ورکشاپ سے بیٹری منگوا سکیں۔ لیکن انگریز پروفیسر کو جیسے ہی صورت حال کا علم ہوا وہ خود بھاگ کر ورکشاپ پہنچا۔ بھاری بیٹری کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اور لاؤڈ اسپیکر کے نظام سے جوڑ کر اس کو چند منٹ میں چلا دیا۔

کسی قوم کے افراد کا یہی مزاج اس قوم کی اجتماعی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ افراد کے اندر یہ اسپرٹ جتنی زیادہ پائی جائے گی، اتنی ہی زیادہ وہ قوم ترقی کرے گی۔

میری قیام گاہ کے قریب ایک اسکول (Hawkley Hall High School) تھا۔ میں روزانہ صبح اور شام یہاں ٹہلنے جایا کرتا تھا۔ ۲۳ ستمبر کو موسم بہت خوشگوار تھا۔ میں ایک عرب نوجوان کے ساتھ اسکول کے سامنے کھلی جگہ پر ٹہل رہا تھا۔ اچانک پولیس کی کار آکر وہاں کھڑی ہوئی۔ اس میں سے پولیس کا ایک آدمی نکلا۔ وہ تیزی سے ہمارے پاس آیا اور انگلش لہجہ میں کہا: براہ کرم معاف کیجئے، اسکول کے لوگوں نے یہ شکایت کی ہے کہ دو داڑھی والے آدمی یہاں روزانہ آتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں کا مقصد کیا ہے۔ میرے ساتھی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کو ٹہلنے کی عادت ہے۔ چنانچہ ہم لوگ یہاں ٹہلنے کے لئے آجاتے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ آپ لوگ کہاں رہتے ہیں۔ بتایا گیا کہ اسی ایریا کے مکان نمبر ۴ 59 میں۔ اس کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

Oh, it is alright. I am sorry.

ہم سے بات کرنے کے بعد وہ اسکول کی عمارت میں داخل ہوا۔ وہاں اسکول کے ذمہ داروں سے بات کی۔ چند منٹ کے بعد وہ باہر نکلا اور اپنی کار میں بیٹھ کر واپس جانے لگا تو اتفاق سے اس کی کار ہمارے پاس سے گزری۔ شیشہ کے اندر سے اس نے ہماری طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر دوبارہ اپنے اطمینان اور معذرت کا اظہار کیا۔

اس قسم کی ہزاروں مختلف باتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ یہاں کی حکومت عدل اور انسانیت کی حکومت ہے۔ مگر شاید ہی کوئی مسلمان اس کا اعتراف کرتا ہوا ملے گا۔ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ برطانیہ رشدی کو سزا کیوں نہیں دیتا۔ وہ بوسنیا کے معاملہ میں مداخلت کیوں نہیں کرتا۔ وغیرہ۔ بعض ذاتی شکایت کی بنا پر وہ نظام کی خوبیوں کا انکار کر رہے ہیں۔ یہ ابولولو فیروز کی سنت ہے نہ کہ صحابہ کی سنت۔ صحابہ جب ہجرت کر کے حبش گئے تو انھوں نے وہاں کے مسیحی بادشاہ کے عدل کا اعتراف کیا اور اس کے لئے دعائیں کیں۔ جب کہ ابولولو مجوسی کا یہ حال ہوا کہ وہ عمر فاروق کے بے مثال عادلانہ نظام کو دیکھنے کے لئے اندھا ہو گیا۔ اس کو صرف اپنی ذاتی شکایت نظر آئی، اور وہ بھی اتنی مبالغہ آمیز انداز میں کہ اس نے عمر فاروق جیسے عادل حکمراں کو قتل کر دیا۔

ایک عرب نوجوان نے بتایا کہ جون ۱۹۹۲ میں وہ مانچسٹر میں تھے۔ اس وقت مانچسٹر کی جامع مسجد میں نومسلم انگریز یوسف اسلام کی تقریر ہوئی۔ وہ بوسنیا کا دورہ کر کے ابھی واپس آئے تھے۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ عرب نوجوان کے الفاظ میں یہ تھا:

إنّ الشئ الذی جعل المسلمین مستضعفین هو ذهاب الخلافة. فان کانت الخلافة قائمة لما استطاع احد ان یفعل بهم هٰذا. لان الخلافة الاسلامیة ستکون لها ایدٍ تمتد لتحمی المسلمین فی کل مکان. فلا بد من اقامة الخلافة فهی الحل لکل ما حل بالمسلمین من ضعف وهوان. والا ستکون النتیجة هی الیوم بوزنیا وغداً بریطانیا

میں نے کہا کہ ہمارا اصل مسئلہ ذہاب خلافت نہیں بلکہ ذہاب عصر ہے۔ ترکوں نے خلافت کو "تلوار" کے زور پر قائم کیا تھا۔ جب تک تلوار کا دور رہا، خلافت بھی باقی رہی۔ جب تلوار کا دور ختم ہو گیا تو ترکوں کی خلافت بھی ختم ہو گئی۔ اب علم کی طاقت کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بے زور ہو جانے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس وقت کا زور (علم) موجود نہیں۔ ایسی حالت میں اصل مسئلہ علم کی طاقت حاصل کرنے کا ہے نہ کہ بے فائدہ طور پر مفروضہ دشمنوں کے خلاف ایسی جنگ چھیڑنے کا جس کا نتیجہ خود اپنی مزید بربادی کے سوا کسی اور شکل میں نکلنے والا نہیں۔

یوسف اسلام نے جو بات کہی وہ ان کی اپنی بات نہیں۔ یہ دراصل ان مسلمانوں کی بات ہے

جن کے درمیان وہ قبول اسلام کے بعد اپنے کو پا رہے ہیں۔ ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد

عبدالعزیز حدو (۲۴ سال) المغرب (الدارالبیضاء) کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت وہ لندن میں کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ۱۲ ستمبر کو ایک انگریز نومسلم کو لے کر میری رہائش گاہ پر آئے۔ اس سفید فام انگریز نوجوان کی عمر ۲۱ سال تھی۔ انھوں نے جولائی ۱۹۹۲ میں اسلام قبول کیا ہے۔ ان کا اسلامی نام عبدالکریم ہے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Christian James Stone
27 Horsford Rd. Brixton SW2 5BW, London.

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کیوں اسلام قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اسلام اس لئے قبول کیا کیوں کہ اسلام معیاری اور عقلی فہم عطا کرتا ہے۔ بچپن میں اور بڑا ہونے کے بعد میں اکثر تنہا سوچتا رہتا تھا۔ جب مجھے اسلام کا علم ہوا تو اس نے میری سوچ کی تکمیل کر دی:

I embraced Islam because Islam makes perfect, rational sense. As a child and adolescent I spent much time alone, just thinking. When Islam was explained to me, it complemented to what I thought.

میں نے کہا کہ مسیحیت کا عقیدہ (مثلاً ٹرینیٹی) عقلی طور پر ناقابل فہم ہے۔ وہ اس بدیہی حقیقت کے خلاف ہے کہ جو چیز تین ہو وہ ایک نہیں ہو سکتی، جو چیز ایک ہو وہ تین نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مسیحی حضرات میں جو لوگ زیادہ سنجیدہ ہوں وہ سخت ذہنی تضاد میں مبتلا رہتے ہیں۔ کیوں کہ اگر وہ عقل کو لیں تو مذہب چھوٹتا ہے، اور اگر مذہب کو لیں تو عقل ساتھ نہیں دیتی۔ انھوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں مسیحی باقی رہتا تو میرا خیال ہے کہ میں یا تو پاگل ہو جاتا یا منافق بن جاتا تاکہ مسیحی معاشرہ میں رہ سکوں:

If I was Christian I imagine that I must either be mad or hypocrite to exist in society.

ان سے دیر تک گفت گو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک روز وہ اپنے والد کے یہاں گئے۔ کھانے پر گوشت تھا۔ انھوں نے گوشت نہیں لیا۔ والد نے اصرار کیا تو اپنے اسلام کو چھپانے کے لئے کہہ دیا کہ میں ویجیٹرین ہوں۔ مگر والد گوشت کے لئے اصرار کرتے رہے تو انھوں نے

بتایا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر والد نے کہا کہ میں جانتا تھا کہ تم ضرور ایسا کروگے:

I knew you would do.

میں نے اس واقعہ کو سنا تو میں نے کہا کہ بیٹے کے حق میں انگریز باپ کا یہ جملہ علامتی طور پر پوری انسانیت کے حق میں ایک پیشگی بیان ہے۔ گویا کہ مغرب کی پچھلی نسل اپنی اگلی نسل سے کہہ رہی ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ ایک روز آئے گا جب کہ تم لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جاؤ گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو اگر اس کے واقعی تقاضوں کے ساتھ انجام دیا جائے تو تمام باپوں کو اپنے بیٹوں سے وہی کہنا پڑے گا جو مذکورہ برطانی باپ نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔

لندن میں راجر ڈیوڈ اسٹون (Roger David Stone) سے ملاقات ہوئی۔ ان کا موضوع فلسفہ ہے۔ وہ کالج میں استاد تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے مذاہب کے مطالعہ سے دلچسپی ہوئی۔ اس سلسلہ میں میں نے اسلام کو سمجھنے کے لئے بعض صوفیاء سے ملاقات کی۔ انھوں نے مجھ کو بتایا کہ اللہ ازلی ہے، محمد ازلی ہے، قرآن ازلی ہے۔ اس کے بعد میرا خیال یہ ہو گیا کہ اسلام بھی ایک قسم کی تثلیث (Trinity) ہے، جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

مسلمانوں میں مجھے کسی ایسے سلسلۂ صوفیاء کا علم نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ عیسائیوں میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اسلام کو ایک قسم کے تثلیثی مذہب کے روپ میں پیش کرنے لگے۔ مسٹر راجر ڈیوڈ اسٹون مذکورہ صوفیاء کا پتہ نہ بتا سکے۔ اس لئے ممکن نہیں کہ میں ان سے ربط قائم کر سکوں۔

ایک مسلمان سے میں نے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ مسیحیوں کی سازش ہے۔ وہ اسلام اور مسیحیت کو ایک ثابت کرنے کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ خواہ وہ سازش ہو یا غیر شعوری طور پر ہو، دونوں حالتوں میں اس کا حل یہ ہے کہ اسلام پر صحیح لٹریچر زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ اسلام کو اتنا زیادہ معروف بنا دیا جائے کہ کوئی اس کی تصویر بگاڑنا چاہے تب بھی وہ اس کی تصویر بگاڑنے پر قادر نہ ہو۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جس طرح ہندستان میں صوفیاء کا طبقہ ویدانت سے متاثر ہو کر وحدت الوجود کا قائل ہو گیا۔ اسی طرح مسیحی دنیا میں کچھ لوگ مسیحی تثلیث سے متاثر ہو کر مذکورہ قسم کی باتیں

کرنے لگے ہیں۔ اس کو قرآن میں مضاہاۃ (التوبہ ۳۰) کہا گیا ہے۔ میرے نزدیک مضاہاۃ کا اس سے بھی زیادہ بڑا واقعہ وہ ہے جو سیاسی مضاہاۃ کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی فلسفوں کا غلبہ ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے اسلام کی سیاسی تعبیر کر ڈالی۔ چوں کہ یہ زمانہ کے مزاج کے مطابق تھی۔ اس لئے وہ بہت جلد لوگوں میں پھیل گئی۔ اگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مضاہاۃ کی تمام قسموں میں سب سے زیادہ نقصان دہ یہی سیاسی مضاہاۃ ہے۔

ایک عرب نوجوان نے اپنے کچھ قصے بتاتے ہوئے کہا کہ ایک بار میں اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ ہم لوگ انگور خریدنے کے لئے دکان پر گئے۔ میں نے بھائی کی مخالفت کے باوجود سستا انگور خریدا۔ گھر پہنچ کر جب اس کو کھول کر کھانے کی میز پر رکھا تو معلوم ہوا کہ اس میں بہت سے انگور خراب ہیں جو کھانے کے لائق نہیں۔ چنانچہ میں نے اس کا ایک حصہ کھایا اور دوسرا حصہ پھینک دیا۔ بھائی نے کہا کہ یہی مطلب ہے اس عربی مثل کا کہ الذی یعجبك رُخصه سترمی نصفه (جس چیز کا سستا ہونا تم کو پسند آتا ہے اس کا نصف حصہ تم کو پھینکنا پڑے گا)

ایک اخوانی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کو معلوم تھا کہ میں مسلم حکومت کے خلاف خروج کو صحیح نہیں سمجھتا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کیسے ایسا کہتے ہیں جب کہ امام احمد بن حنبل نے اپنے وقت کی حکومت سے ٹکراؤ کیا۔ ہم لوگ امام احمد کے اسی مسلک پر ہیں۔

میں نے کہا کہ انھوں نے ٹکراؤ نہیں کیا بلکہ ایک غیر سیاسی معاملہ میں ٹکراؤ پیش آیا۔ پھر میں نے فقہ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ علماء اصول کا اتفاق ہے کہ جب ایک صورت حال کو دوسری صورت حال پر منطبق کیا جائے تو دونوں کے درمیان علۃ مشترکۃ کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس فقہی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو آپ کے اور امام احمد کے درمیان علت مشترک موجود نہیں۔ آپ موجودہ حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے ان کے خلاف مہم چلا رہے ہیں۔ جب کہ امام احمد نے نہ تو ایسا کیا اور نہ ہی ایسا کہا۔ انھوں نے کسی بھی سیاسی ٹکراؤ کے بغیر ایک غیر سیاسی مسئلہ (خلق قرآن) کے بارہ میں اپنی رائے دی تھی اور حکومت غلط فہمی کی بنا پر ان کو سزا دینے پر تل گئی۔ اس لئے آپ کے عمل اور امام احمد کے عمل کے درمیان علت مشترک موجود نہیں۔ اور جب علت مشترک موجود نہیں تو ان کا عمل آپ کے لئے دلیل بھی نہیں بن سکتا۔

اس معاملہ میں امام احمد کا مسلک حقیقۃً وہ ہے جو ابن رجب حنبلی نے اپنی کتاب جامع العلوم والحکم (صفحہ ۲۸۲) میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سلطان کا سامنا مت کرو، کیوں کہ اس کی تلوار کھنچی ہوئی ہے (لا یتعرض الی السلطان فان سیفہ مسلول)، یہی امام احمد کا اصل مسلک ہے اور یہی تمام دوسرے محدثین کا مسلک بھی۔

وگن کے زمانہ قیام میں کچھ لوگ ایک انگریز نومسلم کو میرے پاس لے آئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اس کی عمر تقریباً ۲۵ سال تھی۔ اس کو میں نے دیکھا تو وہ مجھے مجذوبانہ انداز میں دکھائی دیا۔ میرا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ وہ معتدل (sound mind) آدمی نہیں ہے۔ مگر بات کی تو وہ نہایت ذہین معلوم ہوا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ لندن سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے اپنے ذاتی مطالعہ سے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ لندن کے مسلمانوں سے قریب ہوا تو وہ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا ہوگیا۔ وہ جس مسجد میں جاتا ہر مسجد والے کہتے کہ تمہاری نماز غلط ہے۔ تم اس طرح نہیں اُس طرح نماز پڑھو کوئی کہتا کہ کوٹ پتلون اتار کر تم کو اسلامی لباس پہننا چاہئے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد تم کو اپنی ظالم قوم سے متنفر ہوجانا چاہئے تھا اور تم اب تک اپنے دل میں انگریز قوم کی محبت لئے ہوئے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ نظری اسلام سے وہ متاثر ہوا تھا مگر "عملی اسلام" کے بارہ میں وہ سخت توحش میں پڑ گیا۔ چوں کہ وہ بے حد سنجیدہ تھا، اس تجربہ نے اس کو نیم پاگل بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح کے بہت سے نومسلم ہیں۔ حتی کہ یہ یہاں کا ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے۔

وگن میں ۲۲ ستمبر کو میں ایک عرب نوجوان کے ساتھ ٹہلنے کے لئے نکلا۔ ہم لوگ ایک مقام پر پہنچے وہاں سڑک کے دوسری طرف ایک اسکول تھا۔ سفید فام بچے اسکول کے سامنے کھلے میدان میں جمع تھے۔ میں وہاں میدان کے کنارے کھڑا ہوگیا۔ بچوں نے مجھ کو دیکھا تو ہاتھ ہلا ہلا کر بائی بائی کرنے لگے۔ پھر وہ دوڑ کر میرے قریب آئے۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مگر میں اچھی طرح ان کی بات کو نہ سمجھ سکا۔ البتہ ایک بچہ جو مجھ سے کافی قریب آگیا تھا، اس نے بلند آواز میں کہا (Are you Father Chrismas) میرے ساتھی نے مزید سوال کیا تو اس نے کہا (He looks like Father Chrismas) اس اثنا میں ایک اور بچہ قریب آگیا۔ اس نے کہا:

Father Chrismas, get me a computer.

غالب گمان یہی ہے کہ بچوں نے یہ بات تفریح کے طور پر کہی۔ تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسیحی بچوں کی نفسیات کیا ہوتی ہے۔ میرا حلیہ انھیں عجیب نظر آیا۔ اس لئے انھوں نے مجھ کو فادر کرسمس سے تشبیہہ دی۔

ایک عرب نوجوان سے محمد قطب کی کتاب رؤیۃ اسلامیۃ لاحوال العالم المعاصر کے بارہ میں گفت گو ہوئی۔ میں نے کہا کہ آجکل عالم عربی میں جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ زیادہ تر ایسی ہیں جو تفکیر کو بگاڑنے والی ہیں۔ انھیں میں سے یہ کتاب بھی ہے۔ ان کو میرے اس بیان پر تعجب ہوا۔ میں نے مذکورہ کتاب (دار الوطن للنشر، الریاض) کا صفحہ ۱۸۶ دکھایا جس کا عنوان ہے: ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین

میں نے کہا کہ پہلی بات یہ کہ یہ عنوان ہی صحیح نہیں۔ صحیح عنوان یہ ہونا چاہئے کہ ماذا خسر المسلمون بانحطاطھم۔ بوقت انحطاط آدمی کی توجہ اپنے خسران کی طرف ہونی چاہئے تاکہ احتساب خویش کی نفسیات پیدا ہو نہ کہ دوسروں کے خسران پر جو بے بنیاد طور پر فخر کی نفسیات پیدا کرنے والا ہے۔

میں نے کہا کہ مصنف لکھتے ہیں کہ ان اللہ جعل مقادیر البشریہ کلھا مرتبطۃ باحوال ھذہ الامۃ، ان خیر أفخیر و ان شر أفشر (صفحہ ۱۸۶) میں نے کہا کہ قرآن و حدیث میں یہ بات کہاں ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں ہے کہ وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم (محمد ۳۸) قرآن میں واضح طور پر یستبدل قوما غیرکم موجود ہے۔ مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ نستبدل قرآنا غیر ھذا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن اور امت میں فرق ہے۔ جو چیز مستمر ہے وہ قرآن ہے نہ کہ امت۔ قرآن کی آیت فخلف من بعدھم خلف (مریم ۵۹) کے مطابق، ہم اخلاف الامہ ہیں نہ کہ الامہ۔

میں نے کہا کہ مقادیر بشریہ کو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے مرتبط کیا ہے نہ کہ مسلمانوں سے۔ یہ عین وہی غلطی ہے جس میں یہود مبتلا ہوئے اور بالآخر انھوں نے خدائی دین کو نسلی دین بنا دیا۔ اب مختلف الفاظ میں یہی عقیدہ مسلمانوں میں پھیلایا جا رہا ہے۔

عرب نوجوانوں میں قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی ہے جو الرسالہ مشن سے پوری طرح واقف ہے اور اس سے مکمل اتفاق رکھتی ہے۔ اس سفر میں اس قسم کے کئی تجربے پیش آئے۔

اس کا اندازہ اس مثال سے ہوسکتا ہے۔ سفر کے دوران میری ملاقات ایک عرب نوجوان سے ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ یہ واقعہ ان کے الفاظ میں حسب ذیل تھا :

قال لی بعض الشباب یوما۔ انظر الی الذی یُفعل بالمسلمین فی انحاء العالم من بوزنیا الیٰ کشمیر، الیٰ کل مکان۔ فھولاء یریدون أن یقضوا علی الاسلام فلابد ان نقف لمواجهة الخطر بکل قوة (اراد القتال العسکری) فقلت له ان الامر الذی یُحیّرنی ولم اجد له تفسیر، ھو لماذا اصبح مسلموا لعصر الحدیث یعرفون کل شئ ما عدا الصبر۔ فلا یوجد شخص واحد فی العالم الاسلامی ینادی بالصبر رغم ان الصبر مذکور فی القرآن اکثر من القتال۔ فقال ھٰذا یعتمد علی الذی تقصده بالصبر۔ فقلت الصبر لا یعنی اللاعمل بل العمل مع التخطیط۔ فسکت۔

یہ ایک نئی سوچ ہے جو عالم اسلامی میں الرسالہ مشن کے ذریعہ پیدا ہوئی ہے اور دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ کئی عرب نوجوانوں نے اپنی پوری زندگی اس مشن کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیلات بیان کرنے کی گنجائش سفرنامہ میں نہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ حال ہی میں انھوں نے انگریز نومسلم یوسف اسلام کی تقریر سنی۔ وہ پوری کی پوری احتجاجی انداز کی تھی۔ انھوں نے اپنی پوری تقریر میں اعداء اسلام کی سازشوں اور مظالم کا ذکر کیا۔ مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ کیوں کہ یوسف اسلام نے جب اسلام قبول کیا تو ابتدائی زمانہ میں ان کا یہ انداز نہ تھا۔ ان کی ابتدائی زمانہ کی ایک تقریر الرسالہ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں واضح طور پر انھوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ اسلام کے روحانی پہلو نے ان کو متاثر کیا اور اس طرح وہ اسلام میں داخل ہوئے۔

اس معاملہ کی تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی صحبت کے نتیجہ میں ان کے اندر یہ تبدیلی آئی ہے۔ مغربی دنیا میں کثیر تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ مگر حقیقی معنوں میں کوئی دعوتی کام وہ نہیں کر رہے ہیں۔ البتہ خود اپنی فطرت کے زور پر یا ذاتی مطالعہ سے مغرب میں اکثر لوگ اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ یہ نومسلم جب اپنی سابقہ سوسائٹی سے کٹتے ہیں تو وہ اپنے لئے نئی سوسائٹی چاہتے ہیں۔ اس کمی کی تلافی کے لئے قدرتی طور پر وہ مغرب میں مقیم مسلمانوں سے قریب ہوتے ہیں۔ یہ مسلمان زیادہ تر

احتجاجی نفسیات میں جی رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے ان نومسلموں کا مزاج بھی احتجاجی مزاج بن جاتا ہے۔

آج مسلمانوں کو دوسری قوموں کی طرف سے جن "زیادتیوں" کا تجربہ ہو رہا ہے وہ دراصل خدا کی تنبیہات ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے ان زیادتیوں کو خود ان قوموں کی سازش اور ان کے ظلم کے خانہ میں ڈال دیا۔ اس کے نتیجہ میں بہت بڑی مزاجی خرابی واقع ہو گئی۔ مسلمان اگر ان زیادتیوں کو تنبیہات الٰہی سمجھتے تو ان کے اندر اصلاح خویش کا جذبہ ابھرتا۔ مگر جب انھوں نے ان زیادتیوں کو اقوام غیر کی سازشوں کا نتیجہ قرار دیا تو ان کے اندر برعکس طور پر احتجاج غیر کے جذبات ابھر آئے۔ اس غلطی نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سارے معاملہ کو بگاڑ دیا۔

وگن کے زمانہ قیام میں میں جس مکان میں ٹھہرا تھا، اس کے سامنے سڑک کے کنارے زیر زمین پانی کی پائپ میں کچھ خرابی آگئی۔ ۱۲ ستمبر کی صبح کو میں نے دیکھا کہ ایک بڑی سی بند گاڑی وہاں آکر کھڑی ہوئی۔ اس میں ہر قسم کا ضروری سامان موجود تھا۔ گاڑی میں سے ایک سفید فام تندرست آدمی نکلا۔ اس کے ہاتھ میں مخصوص قسم کا پھاوڑا تھا۔ وہ فوراً اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ مسلسل کام کر کے اس نے زمین کھودی۔ پائپ کو درست کیا۔ اس کے بعد پتھر کے ٹکڑوں اور تارکول سے خالی جگہ کو بھر کر پھر اس کو پختہ کیا اور چلا گیا۔

دہلی میں میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ اس طرح کے ایک کام کے لئے بیک وقت کئی آدمی آئیں گے۔ وہ گھنٹوں وہاں ٹھہرنے کے بعد کام کو ادھورا چھوڑ دیں گے۔ اور اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی کہ دوبارہ وہ کب آئیں گے اور کب اپنے چھوڑے ہوئے کام کو مکمل کریں گے۔

برطانیہ کے زمانہ قیام میں کبھی مکھی، مچھر وغیرہ دکھائی نہیں دیا۔ نہ حالت سفر میں اور نہ حالت قیام میں۔ میں اس کے بارہ میں کسی سے پوچھ نہ سکا۔ تاہم عملی تجربہ کے مطابق، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ مہم کے تحت اس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ مسلسل نگرانی کے بغیر خاتمہ کی صورت حال کو باقی نہیں رکھا جا سکتا۔

انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے جو انگریز قوم کے مزاج کو بتاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، سست عمل مگر تیقن کے ساتھ (slow but sure) محمد قطب نے اپنی کتاب رویۃ اسلامیۃ

لاحوال العالم المعاصر میں اس کو مغرب کی شیطانی سیاست کے ایک اصول کے طور پہ ذکر کیا ہے۔
اور اس کا ترجمہ التدرج البطیٔ الاکید المفعول (صفحہ ۹۴) کیا ہے۔ مگر میرے خیال سے اس کا اس کا صحیح مفہوم ان الفاظ میں ادا ہوتا ہے: بطیٔ وانما مؤکد یا بطیٔ ولکن مؤکد۔

انگریز صدیوں سے اسی اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ اور ان کی کامیابی کا کم از کم ایک راز یہ بھی ہے
اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی تم کوئی اقدام کرو تو خواہ تمہارے سفر کی رفتار کتنا ہی سست ہو، مگر اس بات کا پورا اہتمام کرو کہ ہر قدم یقینی طور پر نتیجہ خیز ہو۔ غور کیجئے تو موجودہ مسلمانوں کا ذہن اس کے بالکل خلاف ہے۔ ان کا اصول برعکس طور پر یہ ہے کہ تیزی کے ساتھ بڑے بڑے اقدام کرو، خواہ عملی طور پر اس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔

مذکورہ مثل کوئی غیر اسلامی مثل نہیں۔ یہ فطرت کی زبان میں عین وہی بات ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے: فاصبر ... ولا تستعجل لهم (الاحقاف ۳۵) عجلت سے بچتے ہوئے صابرانہ عمل کرنا یہ ہے کہ آدمی جذباتی انداز میں دوڑ پڑنے کے بجائے سوچ سمجھ کر عمل کرے۔ اور ایک ایک قدم پختہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ہر قسم کی سرگرمیاں ہیں مگر ان کے یہاں صبر اور عدم استعجال موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر اقدام الٹا پڑتا ہے۔ قربانیوں کے پہاڑ کھڑے کرنے کے باوجود موجودہ زمانہ میں وہ کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

۲۴ ستمبر کو وگن میں ایک صاحب نے بتایا کہ ان کی ملاقات ایک نومسلم انگریز سے ہوئی۔ اس وقت ان کے پاس اسلام ایز اٹ از (Islam as it is) کا ایک نسخہ موجود تھا۔ انھوں نے اس کتاب سے آخرت کا باب نومسلم انگریز کو پڑھایا۔ پڑھنے کے بعد اس نے اپنا تاثر ایک کاغذ پر لکھ دیا۔ یہ تاثر اس کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

This is very good. This is based on reason. I haven't read any other book free of any sentimental emotional plea to belief in the hereafter.

ایک مغربی نومسلم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گاڈ ارائزز (God Arises) کا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ یہ وہی کتاب

ہے جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کئی تعلیم یافتہ مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا اسلامی لٹریچر کے ذخیرہ میں گاڈ ارائزز جیسی اور کتابیں پائی جاتی ہیں جو اسلام کی تعلیمات کو علمی اور عقلی دلیل کے ساتھ بیان کرتی ہوں۔ مگر کوئی شخص مجھے اس قسم کی کسی اور کتاب کا سراغ نہ دے سکا۔

انھوں نے کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ قرآن تو سراپا عقلی کتاب ہے۔ وہ عقل کو مخاطب کر کے اپنا پیغام دیتا ہے۔ مگر آجکل کے مسلمانوں کے ذہن سے یہ پہلو مخفی ہو گیا۔ وہ عقلی دلیل اور عقل کو مطمئن کرنے والے اسلوب میں دین کے داعی نہ بن سکے۔ ورنہ ایسی بہت سی کتابیں اسلامی کتبخانہ میں موجود ہوتیں۔ آج کا انسان عقلی اطمینان کے بعد کسی عقیدہ کو اختیار کرتا ہے اور ہمارے پاس عقل کو مطمئن کرنے والی کتابیں نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے عجیب انداز میں کہا کہ جب میں نماز پڑھتا ہوں اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں تو اکثر میری زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلتے ہیں :

Oh, Allah, help us to do intellectual jihad. And bring the rational unbelievers to the fold of Islam.

۲۴ ستمبر کی شام کو وگن سے واپسی ہوئی۔ یہاں سے بذریعہ ٹرین مجھے برمنگھم پہنچنا تھا۔ دو عرب نوجوان جو ریلوے اسٹیشن تک مجھے پہنچانے آئے تھے۔ وہ میرے ساتھ ڈبہ میں داخل ہو گئے۔ وہ اترنا چاہتے تھے کہ ڈبہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ یہاں ٹرین کے دروازہ کو ڈرائیور کھولتا ہے اور وہی بند کرتا ہے۔ ان لوگوں کے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ ہندستانی تجربہ کے تحت مجھے تشویش ہوئی۔ مگر ٹکٹ چیکر آیا تو اس نے پوچھ گچھ کی نہ جرمانہ لگایا۔ سادہ طور پر اس نے کرایہ لے کر وہی ٹکٹ دے دیا۔ جو اسٹیشن پر انھیں ملتا۔ اور پھر تھینک یو کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

ٹرین نہایت صاف ستھری تھی۔ سیٹ سے لے کر ٹائیلٹ تک ہر چیز بالکل ہوائی جہاز کے انداز کی نظر آئی۔ میں نے کہا کہ یہ ٹرین تو گویا زمین پر دوڑتا ہوا ہوائی جہاز ہے۔ ڈبہ میں جگہ جگہ نو اسموکنگ کا اعلان لگا ہوا تھا جس کے اوپر لکھا ہوا تھا کہ اس کی خلاف ورزی پر پچاس پونڈ جرمانہ ہے۔ یعنی ہندستانی روپیہ میں تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ۔ ایک طرف ایک خوبصورت کیس میں ایک خوبصورت ہتھوڑا رکھا ہوا تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ ایمرجنسی کی حالت میں کھڑکی کے شیشہ کو توڑنے کے لئے اس ہتھوڑے کو استعمال کیجئے :

۱ دہلی کے انگریزی اخبار اکونومک ٹائمس کے نمائندہ مسٹر کامل ظہیر نے ۲ اپریل ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیلی فون پر ریکارڈ کیا گیا۔ انٹرویو کا تعلق شرعی قوانین سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اسلام میں سزا کا حق صرف باقاعدہ عدالت کو ہے۔ عدالتی ادارہ کے علاوہ کوئی شخص اگر کسی کو مجرم بتا کر اسے سزا دے تو یہ سراسر حرام ہوگا۔ اور اس طرح کسی کو سزا دینے والا خود سب سے بڑا مجرم قرار پائے گا۔

۲ فرینچ نیوز ایجنسی کے نمائندہ مسٹر نارائن سوامی نے ۷ اپریل ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں انہیں بتایا گیا کہ بابری مسجد اور رام مندر کے نام پر دونوں فرقوں میں جو جذباتی اُبال آیا تھا، ایسا بار بار نہیں ہوتا۔ یہ جذباتی ابال ایک بار آکر اب ہمیشہ کے لئے اِس امکان کو ختم کر چکا ہے کہ مسجد مندر کے نام پر دوبارہ ایسا ابال ملک میں آئے۔

۳ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر جوہر عبد اللہ نے ۱۱ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے مسلم ہریجن اتحاد کے بارہ میں تھا۔ بتایا گیا کہ اس قسم کا اتحاد وقتی طور پر کچھ لیڈروں کو سیاسی فائدہ دے سکتا ہے مگر اس سے نہ مسلمانوں کا کوئی حقیقی فائدہ ہونے والا ہے اور نہ ہریجنوں کا۔ ضرورت ہے کہ دونوں کے اندر قومی سوچ پیدا کی جائے نہ کہ گروہی بنیاد پر محاذ آرائی کی سوچ۔

۴ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ۱۱ اپریل ۱۹۹۴ کو ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا : India-Pakistan Relation اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ سمینار جواہر بھون (نئی دہلی) کے کانفرنس ہال میں ہوا۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔

۵ بھارتیہ مزدور سنگھ کی طرف سے ایک آل انڈیا کانفرنس ناگپور (ریشم باغ) میں ۱۶ - ۱۷ اپریل ۱۹۹۴ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں افتتاحی خطاب کے طور پر ایک تقریر کی اور لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں

سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۶ پانچ جنیہ (ہندی ہفت روزہ) کے اڈیٹر مسٹر ترن وجے نے ۲۰ اپریل ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیلیفون پر ریکارڈ کیا گیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمان مرد اگر انصاف لینے کے لئے ملکی عدالتوں میں جاتا ہے تو مسلمان عورت بھی انصاف لینے کے لئے ملکی عدالت میں جا سکتی ہے۔ یہ اسلام کے خلاف نہیں۔

۷ نئی دہلی کی تنظیم (Movement for National Resurgence) کے تحت ۲۳ اپریل ۱۹۹۴ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع بحث یہ تھا —— (are the police above the law) اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور "کیا پولیس قانون سے بالا ہے" کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔

۸ یو این آئی کی نمائندہ مسز نصرت نے ۲۴ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق زیادہ تر جسٹس تلہری کے تازہ فیصلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مذہبی قانون کی تعبیر کا حق ہمیشہ مذہبی علما کو ہوتا ہے کسی عدالت کو اس کا حق حاصل نہیں۔

۹ انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر پرمود نے ۲۵ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ یونیفارم سول کوڈ موجودہ حالت میں چلنے والا نہیں ہے۔ کیوں کہ ہندستانی سماج عام طور پر اتنا زیادہ روایت پرست ہے کہ وہ اس معاملہ میں کسی بھی خارجی قانون کو قبول نہیں کرے گا۔

۱۰ دینک جاگرن کے نمائندہ مسٹر ارن کمار پانڈے نے ۲۵ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق قرآن کی ان آیتوں سے تھا جن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں غلمان ہوں گے۔ اس کا انھوں نے نہایت غلط مطلب لے رکھا تھا۔ انھیں اس آیت کی صحیح تشریح بتائی گئی اور ان کی غلط فہمی دور کی گئی۔

۱۱ یو پی بھون (نئی دہلی) میں ۲۸ اپریل ۱۹۹۴ کو امرت کلش کے سپادک منڈل کی میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس کے ڈسکشن میں شریک ہوئے۔

طے ہوا کہ مختلف مذاہب پر تعارفی مقالات تیار کرکے ان کو ایک جلد میں شائع کیا جائے۔ "اسلام اور انسانیت" کے موضوع پر مقالہ لکھنے کا کام صدر اسلامی مرکز کے سپرد کیا گیا۔ یہ مجموعہ ہندی اور اردو میں شائع کیا جائے گا۔

۱۲ ہفت روزہ نئی دنیا کے نمائندہ نے ۲ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوال و جواب کا تعلق زیادہ تر جسٹس تلہری کے فیصلہ کی روشنی میں طلاق کے شرعی قانون سے تھا۔

۱۳ الکٹرانکس نکیتن کے کانفرنس ہال (نئی دہلی) میں ۲۹ اپریل ۱۹۹۴ کو آل انڈیا اسلامی تعلیمی کنونشن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ایک بات یہ کہی کہ تعلیم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ مسلم اسکول اور مسلم نصاب کے دائرہ سے باہر نکل کر ہمیں اپنی نسلوں کو تعلیم میں داخل کرنا چاہئے۔ اس معاملہ میں غیر ضروری حساسیت کی ضرورت نہیں۔

۱۴ چنتک منڈل کی طرف سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ۲ مئی ۱۹۹۴ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کا موضوع ہندستانی انسائیکلو پیڈیا (Encyclopaedia Indica) کا منصوبہ طے کرنا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع کے بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ اس سلسلہ میں دوسری میٹنگ ۱۱ مئی کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ہوئی۔

۱۵ ہندستان ٹائمس کے نمائندہ مسٹر اشوک ملک نے ۳ مئی ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر نکاح و طلاق کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یکم مئی کو مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ فیصلہ درست ہے کہ جسٹس تلہری کے فیصلہ پر مسلمان ایجی ٹیشن کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ مگر یہ آدھی بات ہے۔ ان لوگوں کو اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہئے کہ شاہ بانو کے معاملہ میں اور بابری مسجد کے معاملہ میں ایجی ٹیشن کا طریقہ اختیار کرکے انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مسلم عوام کے ذہن کی صفائی کے لئے غلطی کا اعتراف بھی ضروری ہے۔

۱۶ ایشین ایج (Asian Age) کی نمائندہ مسز شیلا ریڈی نے ۶ جون ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ٹیلی فون پر لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر آثار قدیمہ کی مساجد اور ان کے مسائل کے بارہ میں تھا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	\$20 / £10	\$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	\$35 / £18	\$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	\$50 / £25	\$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	\$80 / £40	\$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	£50 / \$100	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۳ سے شائع کیا۔

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London